اسمِ اعظم



علیم الحق حقی

اسمِ اعظم

علیم الحق حقی

اسم اعظم

ایک اندھے انسان کی کہانی۔ دنیا کی ہر چیز سے اس کا اعتماد اٹھ گیا تھا۔ حالات کے جبر نے اس کی بصیرت پر بھی پردہ ڈال دیا تھا۔ وہ اللہ سے شکوہ کرنے لگا تھا مگر پھر اسے اللہ کی عظمت اور رحمت کا قائل ہونا پڑا تھا۔

اجنبی قدموں کی چاپ قریب تر ہوتی جارہی تھی۔ قریب آ کر وہ ٹھہر گئی۔ بوڑھے نجمی کا اندازہ تھا کہ آنے والا عین اس کے سامنے کھڑا ہے۔ دوپہر کا وقت تھا۔ گرمیوں کے دن تھے' یہ وقت اس کے اونگھنے کا تھا۔ ایسے میں بڑے تو کیا' بچے بھی کھیلنے کے لئے گھر سے باہر نہیں نکلتے تھے۔ سامنے پان والے کی دکان کی طرف سے بھی کوئی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔

وہ اس وقت اپنے دوپہر کے ٹھکانے پر بیٹھا تھا۔ صبح جب وہ اور اس کی بیٹی آتے تو نکڑ والے مکان کی دیوار کے ساتھ چادر بچھا لیتے۔ وہاں سے لوگ کثرت سے جو گزرتے تھے! مگر گیارہ بجے کے قریب آنے جانے والوں کی تعداد کم ہوجاتی اور دھوپ زور پکڑنے لگتی۔ تب وہ زیبا سے کہتا۔ "چل بٹیا.......... پیڑ کے نیچے چادر بچھا لے۔" شام تک وہ اسی درخت کے نیچے بیٹھے رہتے۔

آتے ہوئے قدموں کی چاپ اس کے سامنے ٹھہر گئی تھی۔ پھر سکوت تھا۔ نہ کسی سکے کی کھنکھناہٹ' نہ کوئی لفظ' نہ آواز.......... اور نہ ہی جاتے ہوئے قدموں کی چاپ۔ وہ سکوت بوڑھے نجمی کے ناتواں وجود میں ہول بن کر اترنے لگا۔ اس نے سوچا زیبا سے ہی کوئی بات کرلے مگر اس وقت اس کی حساس سماعت سے ایک اور آتی ہوئی چاپ ٹکرائی۔ ذرا دیر بعد ہی ساکت قدم حرکت میں آئے اور جاتی ہوئی چاپ بتانے لگی کہ جانے والا جھجک کر قدم اٹھا رہا ہے جیسے بادلِ ناخواستہ جارہا ہو۔

آنے والے کے قدم ایک پل کو رکے۔ چادر پر بکھرے ہوئے سکوں میں ایک اور سکہ گرا اور یوں کھنکھنا کر ہنسا جیسے کوئی غیروں سے اپنوں کے درمیاں آ کر خوش ہوتا ہے۔ پھر قدم آگے بڑھ گئے۔ بوڑھا نجمی چھوئے بغیر بتا سکتا تھا کہ نووارد سکہ اٹھنی ہے۔

انسانی جسم کا نظام ایسا ہے کہ تمام اعضاء ایک گھرانے کے افراد کی طرح رہتے ہیں۔ دماغ اس گھرانے کا سربراہ ہے اور باقی تمام بھائی۔ اچھے گھرانوں میں جہاں یکجہتی ہوتی ہے' وہاں ایک بھائی.......... بالخصوص بڑے بھائی کو کچھ ہو جائے تو چھوٹے بھائی مل بانٹ کر اس کی ذمے داری کا بوجھ اٹھانے کی کوشش کرتے ہیں تاکہ ممکنہ حد تک اس کی کمی پوری کر دیں.......... تلافی کر دیں۔ چنانچہ بینائی کھو جائے' جو کہ دماغ کی رہنمائی کرتی ہے تو انسان کی تمام حسیں خود کو ہنگامی صورت حال کے لئے تیار کر لیتی ہیں' چوکنا ہو جاتی ہیں۔ سماعت اور شامہ دماغ کی رہنمائی کے لئے اپنے نکتہ عروج کو پہنچ جاتی ہیں۔

اس کی حسِ سماعت پورے عروج پر تھی۔ اس نے بینائی گنوانے کے بعد انحصار ہی اسی حس پر کیا تھا۔ ہوتا بھی یہی ہے' دیکھنے والی آنکھ موجود ہو تو آدمی دوسری حسوں کو زیادہ اہمیت نہیں دیتا۔ ہاں کبھی گہرے اندھیرے میں گھر جائے' جہاں ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہ دے رہا ہو تو وہ اپنی سننے اور سونگھنے کی قوت استعمال کرنے کی کوشش کرتا ہے اور اندھا پن ایک ایسی مسلسل اور اتھاہ تاریکی کا نام ہے' جس میں کبھی روشنی کی کوئی کرن نہیں اترتی' تب حوصلہ افزائی کے نتیجے میں دوسری حسوں کی تعلیم ہوتی ہے۔

ایک بار زیبا نے اس سے کہا بھی تھا۔ "بابا' کبھی کبھی تو مجھے لگتا ہے کہ تمہیں سب کچھ دکھائی دیتا ہے' تم سامنے سے گزرنے والے کو کیسے پہچان لیتے ہو؟ پیسوں کی آواز بھی پہچان لیتے ہو!"

وہ بیٹی کو کیا جواب دیتا! اس نے ایک گھسا پٹا جملہ دہرایا تھا۔ "جب باہر کی آنکھیں بند ہو جاتی ہیں تو دل کی آنکھیں کھل جاتی ہیں بٹیا۔" وہ اس بچی کو اعضائے جسمانی کا نظام کیا سمجھاتا' جس نے کبھی اسکول کی شکل بھی نہیں دیکھی تھی۔ ایسا بھی نہیں تھا کہ وہ زیبا سے صرف علم کی بات کرتا تھا۔ بعض اوقات اس پر سنک سوار ہوتی تو بولتا جاتا۔ اسے یہ خیال بھی نہ رہتا کہ جو کچھ وہ کہہ رہا ہے' وہ معصوم بچی کی سمجھ میں آئے گا بھی یا نہیں لیکن اس کی بات اس کے سوا سننے والا کوئی تھا بھی تو نہیں! زیبا اور صغریٰ خالہ کے سوا پوری دنیا سے تو اس کی لڑائی تھی!

اب وہ سوچ میں تھا کہ آنے والا رک کر خاموش کیوں کھڑا رہا اور دوسرے کے

آتے ہی کیوں چلا گیا؟ اس کے دل میں وسوسہ سر ابھارنے لگا۔ وہ آنے والا کون تھا؟ جو سامنے.......... بہت قریب آ کر کھڑا ہو گیا تھا.......... جس نے کچھ دیا بھی نہیں.......... جو خاموش کھڑا رہا.......... پُرہول خاموشی کا لبادہ اوڑھے۔ جس سے خوف آنے لگا تھا۔

اور بوڑھے نجی کا تجربہ تھا کہ اس کی بھیک کی دکان کے سامنے کوئی بے سبب نہیں ٹھہرتا۔ کچھ دینے کے لئے ٹھہرتا ہے اور جو کچھ نہیں دیتا' وہ لینے کے چکر میں ہوتا ہے۔

ایک بار پہلے بھی ایسے ہی کوئی اس کے قریب آ کر رکا تھا۔ وہ اس وقت ان نوٹوں کو گن رہا تھا' جو اس نے سامنے والے کو ریزگاری دے کر لئے تھے۔ زیبا پان والے کی دکان سے سگریٹ لینے گئی تھی۔

قدموں کی وہ چاپ اس کے بہت قریب آ کر ٹھہر گئی تھی۔ پھر سکوت۔ گرد و پیش کی آوازیں اپنی جگہ تھیں.......... چھولے والے کی پکار.......... بارہ مسالے کے ہیں یہ.......... کھیلتے ہوئے بچوں کے بھاگتے ہوئے قدموں کی آہٹیں.......... سامنے کیسٹ کی دکان سے گانے کی آواز! سب کچھ اپنی جگہ تھا مگر قدموں کی اس آہٹ نے' جو قریب آ کر معدوم ہو گئی تھی' جیسے گرد و پیش کی ہر آواز کو سناٹے میں لپیٹ کر رکھ دیا تھا۔

وہ نوٹ گنتے گنتے ٹھٹک گیا۔ قدموں کی اس ٹھہری ہوئی چاپ سے اسے الجھن ہونے لگی۔ سماعت کے ارتقا کے ساتھ آنکھوں کی محرومی نے اسے ایک اور حس بھی بخشی تھی' سمجھنے کی حس! وہ قدموں کی چاپ سن کر آنے یا جانے والے کے متعلق اندازہ لگا لیتا تھا کہ وہ کیسا آدمی ہے لیکن اس بار اس کا واسطہ خاموشی سے پڑا تھا۔

معاً وہ خاموشی اس کے لئے مفہوم اختیار کر گئی۔ اس کے اندر سے کسی نے کہا' یہ بڑی حریص خاموشی معلوم ہوتی ہے۔ اسی لمحے وہ ہوا اور بہت تیزی سے ہوا۔ کچھ فاصلے سے زیبا چیخی.......... بابا! دو ہاتھ اس کے ہاتھوں سے ٹکرائے۔ اس نے نوٹوں کو مٹھی میں بھینچنے کی کوشش کی مگر اسے محسوس ہوا کہ کچھ نوٹ چھین لئے گئے ہیں اور کچھ رہ گئے ہیں۔ وہ چیخا.......... زیبا چیخی۔ کسی کے بھاگنے کی آواز آئی۔ پھر بھگدڑ مچ گئی۔ طرح طرح کی آوازیں تھیں' ارے پکڑو بدبخت کو۔ بے چارے اندھے فقیر کو لوٹ کر بھاگا ہے۔ جانے نہ پائے' مارو سالے کو! لیکن بھاگنے والا ہاتھ نہ آیا۔

اس دن کے بعد اس نے کبھی باہر بیٹھ کر نوٹ گننے کی حماقت نہیں کی اور اس نے یہ بھی جان لیا کہ خاموشی بھی قدموں کی چاپ کی طرح کئی قسم کی ہوتی ہے۔

آج پھر اس کا واسطہ قدموں کے سکوت سے پڑا تھا اور وہ سہم کر رہ گیا تھا۔ اس کے سامنے آکر رکنے والے نے اسے کچھ نہیں دیا تھا اور کچھ لیا بھی نہیں تھا۔ اس کا کیا مطلب ہوا؟ کسی اور کو آتا دیکھ کر وہ واپس چلا گیا تھا۔ اس کا تو مطلب یہ ہوا کہ وہ کچھ لینا' کچھ چھیننا چاہتا تھا لیکن اس کے پاس تھا ہی کیا! چادر پر بکھرے ہوئے کچھ سکے جو دس روپے بھی نہیں ہوں گے۔ وہ سوچتا اور پریشان ہوتا رہا پھر اس نے تفتیش شروع کر دی۔

"زیبا' یہ جو ابھی کچھ دیر پہلے آیا تھا.........."

"کس کی بات کر رہے ہو بابا؟"

"وہ جو ابھی کچھ دیر پہلے آیا تھا۔ جو.........."

"جس نے اٹھنی دی تھی..........؟"

"نہیں' جو خاموش کھڑا رہا تھا۔"

زیبا خاموش رہی' نجمی نے محسوس کیا کہ وہ جھجک رہی ہے۔

"بتا نا بٹیا!" اس نے پھر پوچھا۔

"پتا نہیں کون تھا بابا۔" زیبا نے سرسراتی ہوئی آواز میں کہا۔ "پہلی بار دیکھا ہے اسے۔"

"کیا کر رہا تھا یہاں کھڑا ہو کر؟"

چند لمحے خاموش رہ کر زیبا اٹک اٹک کر کہنے لگی۔ "بابا.......... کھڑا مجھے گھورتا رہا۔ پھر جیب سے نوٹ نکالا.......... مجھے دکھایا پھر اپنے گالوں اور ہونٹوں پر اسے ملتا رہا۔ اور بابا.......... مجھے دیکھ کر مسکرا بھی رہا تھا۔ بڑی خراب مسکراہٹ تھی اس کی۔ مجھے بڑا ڈر لگ رہا تھا بابا.........."

وہ بیٹی کو کیا بتاتا کہ اس سے زیادہ وہ تو وہ خود ڈر رہا تھا۔ اب بھی ڈر رہا ہے۔

"ارے بٹیا' ڈرنے کی کیا بات ہے!" اس نے بیٹی کو دلاسا دیا پھر پوچھا۔ "نوٹ کون سا تھا اس کے ہاتھ میں؟"

"لال نوٹ تھا' بڑا والا.........."

بوڑھے نجمی کے وجود کے نیچے سے تو جیسے وہ عافیت کی چادر زمین کو بھی نکال لے گئی جس پر بارہ سال سے اس کے لئے کھنکھناتا ہوا رزق اترتا آرہا تھا۔ وہ جیسے پاتال میں گرنے لگا تھا۔ اس کے ہونٹ بھینچے ہوئے تھے۔ چہرے پر پتھر جیسی سختی تھی۔ پھر وہ سخت جھنجلاہٹ میں بدلی اور آہستہ آہستہ نقوش نرمی کی تصویر بنتے گئے۔ آخر میں چہرے پر صرف شکست خوردگی اور بے نور آنکھوں میں بے بسی رہ گئی۔ اس کے اندر ایک صدا' ایک پکار ابھری۔ "اے خدا.......... اے خدا' میں ہار گیا۔ میری مدد کر.........." وہ بارہ سال پرانی جنگ ہار گیا تھا۔ بارہ سال پہلے اعلانِ جنگ بھی اس نے کیا تھا لیکن اسے یاد نہیں رہا تھا کہ اس بات کو بارہ برس ہو گئے ہیں۔

☆======☆======☆

بارہ سال پہلے تک وہ نجم الحسن تھا۔ زندگی کی بھرپور امنگوں' متنوع رنگوں سے سرشار.......... سچے جذبے تھے اس کے پاس۔ وہ بہت کچھ نہیں مانگتا تھا بلکہ جو کچھ اس کے پاس تھا۔ اس پر خدا کا شکر ادا کرتا رہتا تھا۔ اس کی آنکھیں دوسروں سے زیادہ روشن تھیں۔ شادی سے پہلے تک وہ دنیا میں تنہا تھا۔ ماں' باپ' بہن بھائی' رشتے داروں سے محروم۔ وہ ہر رشتے کی قدر جانتا تھا۔ گریجویٹ تھا۔ ایک پرائیویٹ فرم میں اکاؤنٹس کلرک کی حیثیت سے ملازم تھا' معقول تنخواہ تھی۔

۷۱ء کے بعد مشرقی پاکستان یعنی بنگلہ دیش سے لٹے پٹے بہاریوں کی آمد کا سلسلہ شروع ہوا تو اس نے یہ فیصلہ کیا کہ کسی ایسی بہاری لڑکی سے شادی کرے گا جو ہر رشتہ لٹا کر آئی ہو۔ جس کا دنیا میں کوئی نہ ہو۔ ایسی لڑکیوں کی کمی نہ تھی۔ چنانچہ پناہ گزینوں کے ایک کیمپ میں قمرالنساء سے اس کی شادی ہو گئی۔

قمرن اس کی خواہش کے مطابق تھی جیسا کہ اس نے سوچا اور چاہا تھا۔ اس کے ماں باپ' بھائی اس کی آنکھوں کے سامنے ختم کر دیئے گئے تھے۔ یہی نہیں' مکتی باہنی کے غنڈوں نے اسے جی بھر کر پامال بھی کیا تھا۔ وہ عذاب اور اذیت کا ایک سمندر پار کر کے یہاں آئی تھی' عافیت کی تلاش میں' اور اسے یہاں آکر نجم الحسن کی پناہ بھی مل گئی تھی۔

اس نے قمرن کے ہر غم کا مداوا کیا۔ ہر داغ اپنی محبت اور خلوص سے دھویا۔ اسے عزت کی روٹی' تن کے لئے اچھا کپڑا اور روح کے لئے محبت دی۔ قمرن یہ سب کچھ پا کر جیسے جی اٹھی مگر اس کے نزدیک ابھی ایک کمی تھی۔ وہ کرائے کے مکان میں رہتے تھے۔ ان کا اپنا گھر نہیں تھا اور قمرن کو سب سے زیادہ آرزو اپنے گھر کی تھی۔

"وہ بھی ہو جائے گا۔" نجم الحسن اسے دلاسا دیتا۔ "ویسے یہ گھر بھی تو برا نہیں!"

"میں برے بھلے کی بات کب کرتی ہوں؟ میرے لئے اپنی جھونپڑی کرائے کے بنگلے سے بڑھ کر ہے۔"

نجم الحسن کو قمر النسا کی یہی ایک بات بری لگتی تھی۔ خدا سے تو جیسے اسے لگاؤ ہی نہیں تھا۔ شکر ادا کرنا تو جانتی ہی نہیں تھی مگر وہ سوچتا آہستہ آہستہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ اتنے مصائب دیکھ کر' سہہ کر آئی ہے اور دماغ سنک گیا ہے۔ ویسے اچھی بات یہ ہے کہ ہوس نہیں ہے اسے۔ ورنہ عورتیں ہر وقت کچھ نہ کچھ مانگتی ہی رہتی ہیں۔ مانگنے والے کی زبان کبھی نہیں تھکتی۔

"کیوں.......... خدا نے سب کچھ تو دے دیا ہے تمہیں!" اس نے کہا۔

قمر النسا جھنجلا گئی۔ "کچھ بھی نہیں دیا' ہم سے تو سب کچھ چھین لیا ہے اس نے۔ ماں' باپ' بھائی.........."

"یہ نہیں سوچتیں کہ جہاں سے تم آئی ہو وہاں زندہ رہنا ممکن ہی نہیں تھا لیکن بچانے والا ہاتھ مارنے والے ہاتھ سے بڑا تھا' اسی لئے بچ گئیں.........."

"ہونہہ! اس نے نہیں بچایا مجھے۔" قمر النسا کے لہجے میں دنیا جہاں کا زہر تھا اور سانپوں کی پھنکار اتر آئی تھی۔ "مجھے تو عزت گنوانے کے بدلے یہ زندگی ملی ہے.........."

نجم الحسن جانتا تھا کہ یہ زہر آسانی سے نکلنے والا نہیں۔ ہاں کچھ عرصے بعد اس کی محبت زہر ہلاہل کو امرت بنا سکتی ہے۔ بات صرف نعمتوں کا احساس دلاتے رہنے کی تھی۔ اس نے دلیل دینی چاہی۔ "اب تو سب کچھ میسر ہے نا تمہیں!"

"زندگی نہ ہوتی تو کچھ بھی نہ ہوتا۔" قمرن نے پھر زہر اگلا۔

"اچھا یہ بتاؤ یہ نعمت ہے کہ نہیں؟" اس نے سینے پر انگلی رکھتے ہوئے پوچھا۔

قمرن جیسے ایک لمحے میں بدل کر رہ گئی۔ اس نے اس کے سینے پر سر رکھ دیا۔ "جو جانتے ہو وہ پوچھتے کیوں ہو؟"

"تو پھر بتاؤ' یہ نعمت تمہیں کس نے دی؟"

"یہ تو اوپر' بہت پہلے......... پہلے دن ہی میرے نام لکھ دی گئی تھی۔" اس کے لہجے میں شیرینی اتر آئی۔ "جوڑے تو اوپر بنتے ہیں نا جی!"

"بنانا کون ہے؟ کس نے مجھے تمہارے نام لکھا؟"

قمرن سٹپٹا گئی پھر شکست خوردہ لہجے میں بولی۔ "خدا نے۔"

"تو پھر اس کا شکر ادا کیوں نہیں کرتیں؟" نجم الحسن نے لوہا گرم دیکھ کر ضرب لگائی۔ "اس لئے کہ میں تمہیں وہ کچھ نہیں دے سکا جو اوروں کو میسر ہے؟ ریڈیو' ٹی وی' فریج' اور بڑا سا مکان.........."

قمرن نے جلدی سے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ "ایسا مت کہو' مجھے غلط مت سمجھو۔ مجھے کچھ نہیں چاہیے سوائے اپنے گھر کے' چاہے وہ کھلے آسمان کے نیچے ہو' بے چھت' بے دیوار ہو' بس میرا گھر ہو۔"

"اللہ کا شکر ادا کرنا سیکھو گی تو وہ بھی مل جائے گا' انشاء اللہ۔"

وہ کچھ دیر سوچتی رہی پھر دھیمے لہجے میں بولی۔ "ٹھیک ہے' اب سے کوشش کروں گی۔ واقعی ملا تو مجھے بہت کچھ ہے۔ میں بہت ناشکری ہوں نجم۔ بہت بری ہوں میں' اب سے کوشش کروں گی.........." وہ دوپٹے کا پلو منہ پر رکھ کر رونے لگی۔

نجم الحسن ہولے ہولے اس کے کندھے سہلانے لگا۔ "ارے نہیں میری جان۔" اس نے بڑے پیار سے کہا۔ "مجھے تمہارے اور اس کے بیچ میں نہیں آنا چاہئے تھا' تم جانو اور وہ جانے۔ میں اب سمجھا' تم اس سے لڑتی ہو تو پیار میں۔ اس مان کے لئے جو تمہیں اس پر تھا اور تمہیں شاید پتہ نہیں' اب بھی ہے.........."

نجم الحسن قمر النسا کو سب کچھ دینا چاہتا تھا۔ وہ اس کی زخم زخم روح کو محبت کے زم زم سے دھونا چاہتا تھا۔ اسے قمرن میں ایک کمی محسوس ہوئی تھی۔ اس نے واجبی سی تعلیم حاصل کی تھی لیکن ابھی کچھ دیر پہلے کی گفتگو نے اسے ہلا ڈالا تھا۔ قمرن نے جو باتیں

کی تھیں وہ تو کسی پڑھے لکھے کے بس کی بھی نہیں تھیں۔ وہ اعلیٰ تعلیم یافتہ نہیں تھی لیکن اس کا سینہ علمِ زندگی سے معمور تھا۔ زندگی انسان کو جتنی تعلیم دیتی ہے اس سے شخصیت میں عجیب سا سحر اور رچاؤ پیدا ہوتا ہے۔ اس نے دل ہی دل میں خدا کا شکر ادا کیا کہ اس کی بیوی جاہل نہیں۔

اس نے قمرن کو بتائے بغیر باقاعدگی سے پیسے جمع کرنے شروع کر دیئے۔ اسے یقین تھا کہ کبھی نہ کبھی گھر کی صورت میں وہ اسے حیران کر دے گا۔ اس نے باقاعدگی سے اوور ٹائم لگانا شروع کر دیا تھا۔ دفتر میں ایک بیسی بھی ڈال لی تھی۔

ایک سال بعد ان کے ہاں بچی پیدا ہوئی۔ نجم الحسن ہمیشہ سوچتا تھا کہ بچوں کے بڑے خوب صورت اور منفرد نام رکھے گا مگر وہ بچی کا نام سوچ ہی رہا تھا کہ قمرن نے فیصلہ کر لیا۔

"یہ زیب النسا ہے۔" وہ بولی۔

نجم الحسن بھونچکا رہ گیا۔ فرسودہ قرار دے کر اس نام کو بیک جنبش زباں مسترد کر دینا نہایت آسان تھا' بہت ہی آسان مگر اس ایک لمحے میں نجم الحسن نے سوچا کہ یہ خوشیوں سے محروم قمرن کی پہلی سچی خوشی ہے۔ اسے خراب کرنے کے بجائے اس میں اپنی خوشی شامل کر لینا زیادہ بہتر ہے۔ قمرن بڑے غور سے اس کی صورت دیکھ رہی تھی۔ پھر اس نام میں نجم الحسن کو اپنے لئے خوشی مل ہی گئی۔ شاید اس لئے کہ اس کی نیت بڑی کھری تھی۔

"واہ! بہت خوبصورت نام ہے۔" اس نے کہا۔ اس کے لہجے میں سچی خوشی تھی "ہم اسے پیار سے زیبا کہیں گے۔"

اس نے قمرن کی آنکھوں میں' اس کے چہرے کو نہیں دیکھا جہاں شکر کے تمام رنگ جھلملا رہے تھے۔ وہ جان گئی تھی کہ اس کی خاطر نجم الحسن کی محبت نے ناپسندیدگی کو پسندیدگی میں بدل ڈالا ہے۔ درحقیقت اتنی دیر میں اس نے خود کو اس نام سے دست بردار ہونے کے لئے ذہنی طور پر تیار کر لیا تھا لیکن نجم الحسن کی محبت نے اسے جتوا دیا۔

زندگی کی گھما گھمی زیب النسا......... زیبا کے روپ میں آہستہ آہستہ آگے بڑھتی رہی۔ وہ بیٹھی' گھٹنوں چلی' اپنے قدموں پر کھڑی ہوئی اور ہنسنے بولنے لگی۔ ننھی زیبا تین

سال کی ہو گئی۔ ان تین برسوں میں اس نے ماں باپ کو چھوٹی چھوٹی بے شمار خوشیوں سے نہال کر دیا تھا۔ اب تو قمرن کو وہ ایک کمی بھی یاد نہیں رہی تھی جس کا احساس اسے ستاتا تھا۔ کھلے آسمان کے نیچے ہی سہی' ایک گھر کی کمی لیکن نجم الحسن اسے نہیں بھولا تھا۔ اس نے وہ گھر حاصل کر کے ہی دم لیا۔ وہ کچی آبادی میں ایک کچا مکان تھا۔ اس کے دفتر کے ایک چپراسی کا تھا۔ چپراسی اسے بیچنا چاہتا تھا' نجم الحسن نے وہ مکان فوراً ہی دس ہزار میں خرید لیا۔

"تم بیچ کیوں رہے ہو اپنا مکان؟" نجم الحسن نے چپراسی سے پوچھا تھا۔

"بس یونہی صاحب' ضرورت ہے بیٹی کی شادی کے لئے۔"

"مکان ہے کہاں؟"

"چاندنی چوک ہے نا صاحب.........."

"ناظم آباد کے علاقے میں؟"

"ہاں صاحب' چاندنی چوک کے بس اسٹاپ سے ایک سڑک اندر جاتی ہے۔ کچھ آگے جا کر وہ سڑک بائیں طرف مڑ جاتی ہے.........."

"اس علاقے میں تو بہت اچھے' پکے مکان ہیں۔"

"وہاں نہیں صاحب۔ وہ سڑک پہاڑ تک جاتی ہے۔ پہاڑ کے نیچے کچی آبادی ہے' جھگیاں ہیں' کچے مکان ہیں' بہت اچھی جگہ ہے صاحب۔"

"لیکن اس قبضے کی کوئی قانونی حیثیت تو نہیں ہے۔" نجم الحسن نے اعتراض کیا۔ "حکومت جب چاہے مکان گرا دے۔"

"ہر بستی اسی طرح بستی ہے صاحب۔ لوگ جگہ گھیر لیتے ہیں' جب کوئی نئی حکومت آتی ہے یا پرانی حکومت کو کوئی خطرہ محسوس ہوتا ہے تو کچی بستیوں کو لیز دے دی جاتی ہے۔ مکان لیز ہوتا تو میں دس ہزار میں کبھی دیتا بھی نہیں صاحب۔"

نجم الحسن پڑھا لکھا آدمی تھا اور پڑھے لکھے شریف لوگ قانون سے بہت ڈرتے ہیں۔ کچی آبادی اور اس میں بنے ہوئے مکان کے قانونی حیثیت نہیں ہوتی۔ نجم الحسن کو ایسا لگا جیسے اس نے پانی پر بنا ہوا مکان خرید لیا ہو۔ حکومت کی مشینری حرکت میں آئی تو

مکان گرا دیا۔ پیسے ڈوب گئے۔ وہ اپنے گھر کی بنیاد پانی پر نہیں رکھنا چاہتا تھا لیکن قمرن کے خواب کو تعبیر دینے کا موقع ہاتھ آیا تھا۔ وہ اسے کھونا نہیں چاہتا تھا۔ قمرن کی خوشی کے سامنے دس ہزار روپے کا وہ جوکھم بہت حقیر معلوم ہوا۔ اس نے سوچا' میں قمرن کو گھر دے رہا ہوں۔ اب یہ اس کے نصیب کہ یہ گھر اسے کتنے عرصہ کے لئے ملتا ہے اور کون جانے یہ مکان قمرن کا مستقل ہی گھر ہو۔

"تم آج چل کر مجھے مکان دکھا دو۔" اس نے چپراسی سے کہا۔ اس روز اوور ٹائم کرنے کے بجائے وہ چپراسی کے ساتھ چلا گیا۔ مکان دیکھنا تو بس ایک رسم تھی۔ قمرن کہتی تھی کہ میرے لئے اپنی جھگی کرائے کے بنگلے سے بڑھ کر ہے اور یہ کہتے ہوئے اس کے لہجے میں بلا کی سچائی ہوتی تھی۔ اسے تو بس ایک ٹھکانا درکار تھا' جسے وہ گھر کہہ سکے۔

اس نے وہ مکان دیکھا' چھوٹا سا کچا مکان جس میں چھت بھی تھی اور کھلا آسمان بھی۔ دیواریں بھی تھیں اور دروازہ بھی جس میں تالا بھی لگتا تھا۔ نجم الحسن کو مکان اچھا لگا۔ اس نے فوراً بیعانہ ادا کیا اور چابی لے لی۔ اگلے روز پوری ادائیگی کے بعد وہ غیر قانونی مکان قانونی طور پر اس کا ہو جاتا۔

بند مٹھی میں مکان کی چابی چھپائے وہ گھر میں داخل ہوا تو اس کا چہرہ دمک رہا تھا۔ قمرن کو اسے دیکھتے ہی احساس ہو گیا کہ کوئی غیر معمولی بات ہے۔

"کیا بات ہے' بہت خوش نظر آ رہے ہو؟" اس نے پوچھا۔ "اور آج گھر جلدی آ گئے ہو۔"

"میں کہاں خوش ہوں' جانو گی تو خوشی تمہیں ہوگی۔ بوجھو تو ایسی کون سی بات ہو سکتی ہے؟" نجم الحسن نے کہا۔

"میں ناشکری سب کچھ ملنے پر بھی کب خوش ہوں!" قمرن نے سرد آہ بھر کر کہا "میری خوشی اتنی آسان نہیں۔"

نجم الحسن نے ہنستے ہوئے دونوں بند مٹھیاں اس کے سامنے کر دیں۔ ننھی زیبا حیرت سے یہ تماشا دیکھ رہی تھی۔ آج ابا نے اسے گود میں اٹھا کر پیار بھی نہیں کیا تھا۔

"دیکھو قمرن' کسی ایک مٹھی میں تمہارے خواب کی تعبیر ہے۔ بتاؤ تو کون سی مٹھی ہے

وہ؟"

قمرن اور اداس ہو گئی۔ "میرے پاس بہت سے خواب کہاں؟ یہ تو دو آنکھیں ہیں۔ میری ہزار آنکھیں ہوتیں تو بھی ایک ہی خواب دیکھتی' اور اس خواب کی تعبیر اتنی آسانی سے نہیں مل سکتی۔"

"مل سکتی ہے' تم بوجھو تو!"

قمرن کے ہونٹوں پر ایک بجھی بجھی سی مسکراہٹ ابھری۔ اس نے شوہر کی داہنی مٹھی کو دونوں ہاتھوں میں بھر لیا اور اسے آنکھوں سے لگاتے ہوئے بولی۔ "یہ مٹھی خالی بھی ہوگی تو میرے لئے خزانوں سے کم نہیں ہے' سچ کہہ رہی ہوں۔"

نجم الحسن کی آنکھیں بھیگ گئیں۔ اسے احساس ہوا کہ اس نے کیسا کھیل کھیلا ہے۔ وہ باعثِ آزار بھی ہو سکتا تھا۔ قمرن اب اس کی بند مٹھی کو کھولنے کی کوشش کر رہی تھی۔ مٹھی کھلی اور چابی زمین پر گر پڑی۔ قمرن نے حیرت سے جھک کر چابی اٹھا لی اور اسے غور سے دیکھنے لگی۔

"سائیکل خریدی ہے تم نے؟" اس نے پوچھا۔

نجم الحسن نے نفی میں سر ہلا دیا۔

"پھر یہ کیا ہے؟"

"یہ.......... یہ.........." نجم الحسن سے بولا نہیں جا رہا تھا۔ "یہ.......... تمہارا.......... گھر ہے۔" اس نے بمشکل کہا۔

"ایسا مذاق مت کرو نجمی۔" قمرن نے کہا اور بے ساختہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ اسے روتے دیکھ کر زیبا بھی رونے لگی۔

"ارے.......... ارے.......... یہ کیا کرتی ہو پگلی!" نجم الحسن بوکھلا گیا۔ "خوشی کے موقع پر روتی ہو؟ دیکھو زیبا بھی رو رہی ہے۔ یہ تو بہت بری بات ہے' پھر ناشکرا پن.........."

"تو.......... تو کیا سچ مچ؟" قمرن رونا بھول گئی۔

"ہاں یہ تمہارے گھر کی چابی ہے جو تمہارا رستہ تک رہا ہے۔"

اب قمرن سکتے کی سی کیفیت میں چابی کو گھورے جا رہی تھی۔ کچھ دیر بعد اس کے لب ہلے۔ "تو کیا سچ مچ..........؟ کیسے ہوا یہ؟"

نجم الحسن نے اسے تفصیل سے سب کچھ بتا دیا۔ ذرا دیر میں فضا بدل گئی۔ وہ تینوں ہنس رہے تھے۔

"تم نے دیکھا ہے میرا گھر؟" کچھ دیر بعد قمرن نے پوچھا۔

"ہاں وہیں سے آ رہا ہوں میں۔"

"تو مجھے بھی لے چلو۔"

"اس وقت؟" نجم الحسن نے گھڑی دیکھی' آٹھ بج رہے تھے۔

"ہاں اپنے گھر تو آدمی کسی وقت بھی جا سکتا ہے۔"

"ہاں یہ تو ہے لیکن اس وقت کیا ضروری ہے' کل چلی چلنا۔"

"نہیں' میں تو ابھی چلوں گی۔" قمرن نے کہا اور اپنے ریزگاری کے ڈبے میں جانے کیا ٹھن ٹھن کرنے لگی۔ پھر وہ کچن کی طرف گئی' واپس آئی تو اس کے ہاتھ میں ایک پوٹلیا تھی۔ "چلو' بس چل دو۔" اس کے لہجے میں بے تابی تھی۔

وہ زیبا کی انگلی تھام کر باہر آ گیا۔ قمرن اس کے پیچھے پیچھے تھی۔ اس نے دروازے میں تالا ڈالا اور انہیں لے کر مین روڈ کی طرف چل دیا۔ جیب میں کافی پیسے تھے چنانچہ اس نے رکشا روک لیا۔ کچے مکان کے سامنے رکشے سے اترے۔

"یہ ہے تمہارا گھر۔" اس نے بھیگی بھیگی آواز میں قمرن سے کہا۔

قمرن کچھ دیر دروازے کو دیکھتی رہی پھر اس نے شوہر کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ "یہ لو چابی' دروازہ کھولو۔" اس کی آواز لرز رہی تھی۔

"نہیں' تالا تم ہی کھولو گی۔ اپنے گھر میں سب سے پہلے تم ہی قدم رکھو گی۔ چلو تالا کھولو۔"

علاقے میں بجلی نہ ہونے کی وجہ سے اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ نجم الحسن کو اپنی بے پروائی پر افسوس ہونے لگا۔ کاش وہ ٹارچ ہی لے آتا ساتھ۔ قمرن جھک کر تالے میں چابی لگانے کی کوشش کر رہی تھی لیکن وہ لگ نہیں پا رہی تھی۔

"سنو میرے چابی والے ہاتھ پہ اپنا ہاتھ رکھ دو۔" اس نے لرزیدہ آواز میں نجم الحسن سے کہا۔

نجم الحسن نے جھک کر اس کے ہاتھ کو اپنے ہاتھ سے سہارا دیا تو اسے احساس ہوا کہ قمرن پوری جان سے کانپ رہی ہے۔ "ارے تم سے تو اپنے گھر کا تالا ہی نہیں کھل رہا۔" اس نے قمرن کو چھیڑا۔

"تم نہیں جانتے ہو نجمی! تم سمجھ ہی نہیں سکتے۔ یہ گھر مجھے بہت جلدی' بہت آسانی سے مل گیا ہے نا۔ مجھے یقین ہی نہیں آ رہا ہے۔"

نجم الحسن کے ہاتھ کے سہارے نے تالا کھلوا دیا۔ قمرن نے لرزتے ہاتھوں سے کنڈی کھولی اور بڑی نرمی' بڑی آہستگی سے دروازے کو پیچھے دھکیلا' دونوں پٹ کھل گئے۔ گھر کا چھوٹا سا آنگن ان کے لے بانہیں کھولے کھڑا تھا۔ اس کے پیچھے کچی دیواروں اور چھت کا ایک کمرا مسکرا رہا تھا۔ وہ دیر تک کھڑے سامنے کی سمت تکتے رہے جیسے کوئی بہت خوب صورت منظر نگاہوں کے روبرو ہو۔ ننھی زیبا بھی خاموش تھی' گویا وہ بھی ان لمحوں کی اہمیت سے واقف ہو۔

"چلو نا.......... اندر آ جاؤ۔" آخر کار نجم الحسن نے کہا۔

"ہم تینوں ساتھ ہی چلیں گے۔" قمرن بولی۔

"نہیں' یہ تمہارا خواب ہے' اس گھر میں پہلا قدم تمہارا پڑے گا۔"

"خواب تو میرا تھا لیکن تعبیر ہم تینوں کی.......... نہیں چاروں کی ہے۔" وہ کہتے کہتے شرما گئی۔ اس کی نگاہیں اپنے پیٹ کی طرف جھک گئیں۔ "ہم سب ایک ساتھ اس گھر میں قدم رکھیں گے۔ آؤ' پہلے سیدھا پاؤں بڑھانا اور بسم اللہ پڑھنا.........."

وہ اس طرح گھر میں داخل ہوئے کہ زیبا بیچ میں تھی۔ ایک طرف سے اس نے باپ کی اور دوسری طرف سے ماں کی انگلی تھامی ہوئی تھی۔

"ٹھہر جاؤ۔" اندر داخل ہوتے ہوئے قمرن نے کہا۔ اس نے اپنی پوٹلیا کھولی' اس میں پانچ روٹیاں تھیں۔ اس نے وہ روٹیاں دروازے کی داہنی چوکھٹ کے ساتھ دیوار سے لگا کر رکھ دیں۔ پھر اس نے پانچ چونیاں نکالیں اور انہیں بائیں چوکھٹ کے ساتھ رکھ دیا۔

"یہ کیا ٹونا کر رہی ہو؟" نجم الحسن نے کہا۔

"یہ گھر کی خیریت کے لئے ہے۔ بزرگ کہتے ہیں.........."

"میں سوچتا ہوں جا کر موم بتیاں لے آؤں لیکن تمہیں.........."

"تو لے آؤ نا!"

"تمہیں اکیلا چھوڑ کر.........."

"جاؤ موم بتیاں لے آؤ۔" قمرن نے پھر اس کی بات کاٹ دی۔

"لیکن یہ اجنبی جگہ ہے۔ تمہیں ڈر نہیں لگے گا؟"

"اجنبی جگہ؟ ارے یہ گھر ہے میرا۔ اپنے گھر میں بھی کسی عورت کو ڈر لگتا ہے! جاؤ موم بتیاں لے آؤ۔ اچھا ہے، ہم پہلی ہی رات اپنے گھر میں روشنی کر لیں، اندھیرا نہیں ہونا چاہیے، جاؤ۔"

نجم الحسن گھر سے نکل آیا۔ دکان کی تلاش میں پہلی بار اس نے بستی کا جائزہ لیا۔ تنگ سی گلیاں تھیں۔ بے ترتیب کچے مکانات تھے۔ کہیں ایک آدھ پکا مکان بھی تھا اور کہیں کہیں جھونپڑیاں بھی تھیں.......... کچھ آگے جا کر اسے ایک دکان نظر آئی جو ایک کچے مکان کا ایک حصہ تھی۔ وہ موم بتیاں لے کر واپس آیا تو قمرن گھر کا جائزہ لیتی پھر رہی تھی۔ ننھی زیبا انگلی پکڑے اس کے ساتھ ساتھ تھی۔

"گھر تو بہت اچھا ہے۔" قمرن نے چہک کر کہا۔ "میں نے ایک ایک کونا دیکھ لیا۔"

"اتنے اندھیرے میں!"

"تمہیں کیا پتا، میری آنکھوں کی روشنی کتنی بڑھ گئی ہے۔" نجم الحسن نے ایک موم بتی جلائی۔ پھر سگریٹ سلگائی۔

"آؤ میرے ساتھ، میں تمہیں دکھاؤں گی۔" قمرن نے اسے کہا۔ وہ موم بتی ہاتھ میں لئے ایک ایک کونا دکھاتی پھری۔ نجم الحسن سگریٹ کے کش لیتے ہوئے اس کے رواں تبصرے سے بھی لطف لیتا رہا۔ "میں دیواروں اور فرش کو روز مٹی سے لیپا کروں گی۔" وہ اپنی دھن میں کہے جا رہی تھی۔ "تم دیکھنا لپائی کے بعد کیسی سوندھی سوندھی مہک اٹھا کرے گی، پھر کیسا جگمگ جگمگ کرے گا۔ آنگن بہت ہوادار ہے۔ گرمیوں میں مزے آ

جائیں گے۔ دو چارپائیاں ڈالا کریں گے آنگن میں، اور اس دیوار کے ساتھ میں کیاری بناؤں گی۔ موتیا، چنبیلی اور گلاب لگاؤں گی، اور ہاں، رات کی رانی بھی۔ تم نے اتنی محنت کی، دن رات ایک کئے اور مجھے گھر دیا تو اب اسے جنت بنتے بھی دیکھنا ہے۔"

وہ کہتی رہی، نجم الحسن سنتا رہا اور خوش ہوتا رہا۔ قمرن کا یہ لب و لہجہ اس کے لئے نیا تھا۔ اس کی خوشی اس کی روح تک کو مسرور کر رہی تھی۔ اسے احساس ہو رہا تھا کہ اس نے جنت کمالی ہے۔

"اب چلو قمرن۔" آخر کار اس نے کہا۔ "ہمیں گھر بھی پہنچنا ہے۔"

"گھر؟" وہ جیسے خواب سے چونک اٹھی۔ "گھر ہی میں تو ہیں ہم.......... جانا ضروری ہے کیا؟"

"نہیں تو سوؤ گی کہاں؟"

"یہیں آنگن میں، زمین پر، کھلے آسمان کے نیچے۔" وہ گنگنائی۔ "یہ اپنا گھر ہے، اپنا۔"

وہ سنجیدہ تھی۔ نجم الحسن نے بڑی مشکل سے اسے سمجھایا۔ "ارے یہ تمہارا اپنا گھر ہے، پندرہ بیس دن ہی کی تو بات ہے، پھر ہم یہیں آ جائیں گے۔ اب بچی تو نہ بنو۔"

"پندرہ بیس دن؟ وہ کیوں؟" اس کے لہجے میں احتجاج تھا۔

"ارے بھئی، اب اس حالت میں تو تم سامان ڈھونے سے رہیں! زچگی سے نمٹ لو۔" نجم الحسن نے کہا۔ وہ جانتا تھا کہ لیڈی ڈاکٹر کے اندازے کے مطابق بچے کی پیدائش میں صرف چھ دن باقی تھے۔

"نہیں، ہرگز نہیں ہم صبح ہی اپنا سامان یہیں لے آئیں گے۔" قمرن نے یہ فیصلہ سنایا۔ "میں اپنے گھر سے ایک پل بھی دور نہیں رہوں گی اور سنو جی، میں یہیں سے اسپتال جاؤں گی اور بچے کو لے کر یہیں واپس آؤں گی۔ میرا یہ بچہ بے گھر نہیں ہوگا، گھر والا ہوگا۔"

"کیسی بچوں جیسی باتیں کر رہی ہو؟"

"بچوں جیسی باتیں! جانتے ہو جب بنگلہ دیش بن رہا تھا تو کتنی ہی بھاری حاملہ

عورتوں نے عہد کر لیا تھا کہ غلام سرزمین پر بچہ نہیں جنیں گی۔ عورت آمادہ نہ ہو تو بچہ ہوتا بھی نہیں ہے لیکن عورت کی جان بھی خطرے میں پڑ جاتی ہے۔ کتنی عورتیں اپنے بچے سمیت مر گئیں لیکن انہوں نے اپنی ضد پوری کی۔ خدا کا شکر ہے، میں تو آزاد زمین پر ماں بنی۔ اب اس کی رحمت سے میرا دوسرا بچہ اپنے گھر میں آنکھیں کھولے گا۔ اپنے گھر کے آنگن کی مٹی چاٹے گا۔ میں گھر ہوتے ہوئے بھی اسے بے گھری کیوں دوں؟"

"لیکن قمرن.........."

"لیکن ویکن کچھ نہیں۔" قمرن کے لہجے میں قطعیت تھی۔ "اگر تمہیں دفتر سے چھٹی نہیں ملتی ہے تو نہ ملے۔ میں خود سب سامان اٹھالاؤں گی۔ تم بالکل فکر نہ کرو۔"

نجم الحسن جانتا تھا کہ اب اسے نہیں سمجھا سکتا لیکن وہ یہ بھی جانتا تھا کہ اس بار قمرن کا کیس پیچیدہ ہے۔ اس کا بلڈ پریشر بڑھتا رہتا تھا اور ڈاکٹر کا کہنا تھا کہ یہ علامت اچھی نہیں۔ ایسے میں ذرا سی بے احتیاطی خدانخواستہ مہلک ثابت ہو سکتی تھی۔ اس نے سوچا اگلے روز دفتر جا کر دس دن کی چھٹی کی درخواست دے گا اور واپس آ کر شفٹنگ کا بندوبست کرے گا۔ سامان نہ تو ان کے پاس زیادہ تھا، نہ ہی بھاری تھا۔ دو مزدور کافی تھے۔ اس کے پاس ابھی دو ہزار روپے پڑے تھے۔ پیسے کی طرف سے کوئی پریشانی نہیں تھی۔

واپس پہنچ کر انہوں نے کھانا کھایا۔ نجم الحسن کو فوراً ہی نیند آ گئی۔ آدھی رات کے قریب اس کی آنکھ کھلی تو قمرن کی آواز سنائی دی۔ "اللہ تیرا شکر ہے، اللہ تیرا شکر ہے.........." وہ بس اسی جملے کی گردان کئے جا رہی تھی۔

"قمرن.......... قمرن.........." نجم الحسن نے اسے پکارا۔

لیکن وہ گہری نیند میں تھی۔ حالانکہ وہ اتنی گہری نیند کبھی نہیں سوتی تھی۔ اس کی ایک آواز پر جاگ اٹھتی تھی مگر اس وقت وہ اس کی ہر پکار سے نہ سننے کے فاصلے پر تھی۔ اس کی آواز شکر کے بے پایاں جذبے میں بھیگی ہوئی تھی اور وہ بس یہی کہے جا رہی تھی۔

"اللہ تیرا شکر ہے، اللہ تیرا شکر ہے.........."

نجم الحسن کے دل سے بھی بے ساختہ یہی آواز اٹھی۔ "اللہ تیرا شکر ہے۔ تُو نے میری بیوی کو اپنے شکر کی توفیق دی۔" وہ بہت خوش تھا۔ بے وقت آنکھ کھلنے پر اسے وہ

خوشی ملی تھی جس کے لئے وہ چار سال سے ترس رہا تھا۔ شاید وہ دن ہی بہت اچھا تھا۔ جاگتے میں ناشکرا پن کرنے والی قمرن سوتے میں بھی شکر ادا کر رہی تھی۔ اس نے اٹھ کر پانی پیا اور پھر بستر پر آ لیٹا۔ قمرن اب بھی اللہ کا شکر ادا کئے جا رہی تھی۔ پھر اسی شکر نے اسے تھپک تھپک کے سلا دیا۔

دفتر سے اسے دس دن کی رخصت مل گئی۔ اس نے اس سے پہلے کبھی چھٹی مانگی ہی نہیں تھی۔ شام تک وہ اپنا سامان نئے گھر میں قرینے سے رکھ چکے تھے۔ قمرن لمحے بھر کو خالی نہیں بیٹھی تھی، کچھ نہ کچھ کرتی ہی رہی تھی۔ اس نے نجم الحسن سے کھدوائی کروا کے کیاری بنوائی تھی اور اب بیٹھی کھرپی سے مٹی کو برابر کر رہی تھی۔ "اب تم مجھے کھاد لا کر دو اور تین پودے بھی، ایک موتیا کا، ایک چنبیلی کا اور ایک گلاب کا۔" اس نے کہا۔

"اچھا لے آؤں گا۔" نجم الحسن نے جماہی لیتے ہوئے کہا۔ تھکن سے برا حال ہو رہا تھا۔

"لے آؤں گا نہیں، ابھی لاؤ اور ہاں قیمہ بھی لے آنا۔ ساتھ ہی ہری مرچیں اور ٹماٹر بھی۔"

"اب چھوڑو نا۔ اتنی تھکی ہوئی ہو۔ ہوٹل سے لے آؤں گا کھانا۔"

"بس ایک وقت ہوٹل کا کھا لیا، بہت کافی ہے۔ اس وقت تو میں قیمہ بھون کر روٹی ڈال لوں گی۔ جاؤ، سُستی مت کرو۔"

نجم الحسن نے اٹھتے ہوئے انگڑائی لی اور گھر سے باہر نکل آیا۔ وہ دن اور اگلے چار دن ان سب کی زندگی کے خوشگوار ترین دن تھے۔ انہوں نے کچھ ضروری خریداری کی ساتھ مل کر ہر کام کیا۔ دیواریں اور فرش لیپا، پودے لگائے اور انہیں پانی دیتے رہے۔ نجم الحسن نے پہلی بار کچن کے کاموں میں قمرن کا ہاتھ بٹایا۔ زندگی میں پہلی بار وہ اس قدر مکمل طور پر یکجا ہوئے تھے۔ چنانچہ وہ ایک ایک لمحے سے محظوظ ہوتے رہے۔ وہ اپنے آپ میں، ایک دوسرے میں یوں مگن ہوئے کہ انہیں پڑوسیوں سے ملنے کا خیال ہی نہیں آیا۔

برابر والی بیوہ خاتون خود ہی ان سے ملنے چلی آئی، اس کی عمر پینتالیس پچاس کے

درمیان تھی۔ وہ موٹی تازی اور بہت خوش مزاج عورت تھی۔ اس کا نام صغریٰ تھا۔ وہ ان سے بہت اچھی طرح ملی اور بہت خوش ہوئی۔

"میں تمہارے داہنے ہاتھ والے مکان میں رہتی ہوں۔" اس نے کہا۔ "کسی چیز کی ضرورت ہو' کوئی بات ہو تو بے تکلف دروازہ کھٹکھٹا دینا۔"

وہ ضرورت اگلی صبح ہی پڑ گئی۔ دس بجے کے قریب قمرن کو درد اٹھا۔ پچھلی بار ڈاکٹر نے کہا تھا' اس ہفتے میں جب بھی درد اٹھے فوراً اسپتال آ جانا۔ تو اب انہیں عباسی شہید اسپتال جانا تھا۔ مسئلہ بچی زیبا کا تھا۔ قمرن نے کہا کہ زیبن کو صغریٰ خالہ کے ہاں چھوڑ دیتے ہیں۔

"ٹھیک ہے تم لوگ جاؤ' بچی کو میں سنبھال لوں گی۔" صغریٰ خالہ نے کہا۔

زیبا ابھی اپنی پڑوسن سے مانوس نہیں ہوئی تھی۔ اس نے ہنگامہ کھڑا کر دیا۔ نجم اور قمرن نے اسے سمجھایا۔ صغریٰ نہ جانے کہاں سے پلاسٹک کے کھلونے لے آئی اور اسے بہلانے لگی۔ بڑی مشکل سے وہ گھر سے نکل آئے لیکن ان کا دل زیبا ہی میں اٹکا رہا۔

قمرن کے درد میں اضافہ ہو گیا تھا لیکن انہیں چوک تک پیدل ہی جانا پڑا۔ چوک سے انہوں نے عباسی شہید اسپتال تک جانے کے لئے ٹیکسی کی۔ ہرچند کہ وہ زیادہ دور نہیں تھا۔ قمرن کا یہ حال تھا کہ چیخیں ضبط کرنے کی کوشش میں وہ اپنا ہاتھ چبائے ڈال رہی تھی۔ اسپتال پہنچتے ہی قمرن کو فوراً لیبر روم میں لے جایا گیا۔ نجم الحسن باہر ٹہلتا' ایک ایک پل شمار کرتا رہا۔ دو گھنٹے کے بعد ڈاکٹر باہر آئی۔ وہ دو گھنٹے اس کے لئے ایک طویل عمر کے برابر تھے۔

"دیکھئے بلڈ پریشر بہت ہائی ہے۔" ڈاکٹر نے اسے قریب بلا کر کہا۔ "کیس کافی سیریس ہے۔ میں یہ دوائیں لکھ کر دے رہی ہوں۔ یہ لے آیئے جلدی سے۔" اس نے دواؤں کا پرچا اسے تھما دیا۔

نجم الحسن نے اسپتال کے قریب ہر میڈیکل سٹور دیکھ لیا لیکن وہ دوائیں نہیں ملیں۔ ایک میڈیکل اسٹور والے نے کہا۔ "یہ دوائیں آج کل شارٹ ہیں۔ آپ ایسا کریں' صدر چلے جائیں۔ وہاں مل جائیں گی۔" اس نے صدر کے لئے رکشا کر لیا۔

نجم الحسن کو صدر کے ایک میڈیکل سٹور سے دوائیں تو مل گئیں لیکن اسپتال جانے کے لئے کوئی رکشا ٹیکسی والا تیار نہیں تھا۔ بسیں بھی بند ہو گئی تھیں۔ افواہ تھی کہ ناظم آباد کے علاقے میں زبردست ہنگامہ ہو رہا ہے۔ وہ دواؤں کا شاپنگ بیگ ہاتھ میں لئے حیران و پریشان کھڑا تھا۔ اسے ہسپتال سے نکلے دو گھنٹے ہو گئے تھے۔ ڈاکٹر نے کہا تھا کہ دوائیں جلدی لے آؤ۔ اب دوائیں مل گئی تھیں تو ٹرانسپورٹ کا مسئلہ کھڑا ہو گیا تھا۔ وہ فکر میں تھا کہ نہ جانے قمرن کا کیا حال ہو گا۔ آخر کار منت سماجت کے بعد ایک خدا ترس بوڑھا رکشا والا اسے لے جانے پر آمادہ ہوا۔

وہ لسبیلہ پہنچے تو پتا چلا کہ پل سے آگے راستہ بند ہے' ہنگامہ شدید ہے۔ آنسو گیس کے اثرات یہاں تک محسوس ہو رہے تھے۔ رکشا والے نے رکشہ داہنی سمت موڑ کر تین ہٹی کی طرف دوڑا دیا۔ نجم الحسن اس وقت مجسم دعا بنا ہوا تھا۔ اندیشوں کے بوجھ سے اس کا دماغ سن ہو رہا تھا۔ نگاہوں میں قمرالنسا کی صورت تھی۔ لیاقت آباد ڈاک خانے تک معاملہ ٹھیک ٹھاک تھا البتہ جابجا پولیس کی نفری نظر آ رہی تھی لیکن ڈاک خانے اور دس نمبر کے درمیان سڑک پر اچانک ہنگامہ شروع ہو گیا۔ اب نہ واپسی کا راستہ تھا نہ دائیں طرف مڑنے کا۔

"صاحب اب میں کچھ نہیں کر سکتا۔" رکشا ڈرائیور نے کہا۔ "اب آپ گلیوں میں سے نکل کر ناظم آباد پہنچنے کی کوشش کرو۔"

نجم الحسن نے بے حد ممنونیت سے اسے دیکھا۔ وہ جانتا تھا کہ اس رکشا ڈرائیور کا احسان وہ کبھی نہیں چکا سکے گا۔ اس نے اپنی جان خطرے میں ڈال کر اسے اسپتال تک پہنچانے کی کوشش کی تھی۔

"تمہارا بہت شکریہ بھائی۔ اللہ تمہیں اس کی جزا دے۔" اس نے رکشہ کا کرایہ دیا اور آگے بڑھا۔

وہاں تو جیسے حشر برپا تھا۔ آنسو گیس کے شیل پھینکے جا رہے تھے۔ پولیس نے لاٹھی چارج بھی شروع کر دیا تھا۔ لوگوں کو منتشر ہونے کی وارننگ بھی دی جا رہی تھی۔ ہر طرف شور و غل تھا۔ بھگدڑ مچی ہوئی تھی۔ لوگ اندھا دھند گلیوں کی طرف بھاگ رہے

تھے۔ وہ دواؤں کا شاپنگ بیگ سینے سے لگائے بھیڑ میں راستہ بنانے کی کوشش کر رہا تھا۔ آنسو گیس سے اس کی آنکھوں' ناک اور حلق میں جلن ہو رہی تھی۔ آنسو بہے جا رہے تھے۔ وہ داہنی سمت مڑنے والی پہلی گلی سے کچھ دور تھا کہ اس کے سر پر لاٹھی لگی۔ اس نے چکرا کر گرتے گرتے خود کو سنبھالا۔ اسے اسپتال پہنچنا تھا اور گرنے کے بعد یہ ممکن نہیں تھا۔

"خدا کے لئے.......... مجھے راستہ دو' مجھے جانے دو' مجھے مت مارو۔ میری بیوی اسپتال میں.........." وہ دیوانوں کی طرح چلانے لگا پھر نعروں کی گونج میں اس کے سر پر دوسری لاٹھی لگی۔ اس بار وہ آنسو گیس کی جلن سے بے نیاز ہو گیا کیوں کہ اس کی آنکھوں میں خون بھر گیا تھا۔ سر میں شدید ٹیسیں اٹھ رہی تھیں۔ ناقابل بیان اذیت تھی۔ اس نے جان لیا تھا کہ اس ہنگامے میں کوئی اس کی پکار' اس کی فریاد نہ سنے گا.......... کوئی نہیں سنے گا' سوائے خدا کے! سو وہ خدا کو مدد کے لئے پکارتا رہا۔ وہ اندازے سے آگے بڑھنے کی کوشش کرتا رہا۔ اپنی دانست میں وہ گلی میں مڑ گیا تھا لیکن اسے اندازہ نہیں تھا کہ لوگوں کے دھکوں نے اس کا رخ کس حد تک تبدیل کر دیا ہے۔ درحقیقت وہ اب بھی مین روڈ پر ہی تھا۔ خون کے ساتھ ساتھ اس کے جسم سے توانائی اور دماغ سے ہوش و حواس بھی رخصت ہو رہے تھے۔ اسے گھبراہٹ ہونے لگی۔ لرزتی ٹانگوں نے اسے احساس دلایا کہ وہ اب زیادہ دیر اپنے قدموں پر کھڑا نہیں رہ سکے گا۔

"اے اللہ!" وہ ڈوبتی آواز میں چلایا۔ "اے اللہ میری مدد کر.......... مجھ پر رحم کر۔ اے اللہ! اے اللہ۔" بے ہوش ہو کر گرنے تک وہ یوں ہی پکارتا رہا۔ ایمبولینس اس کے قریب آ کر رکی۔ اسے ایمبولینس میں ڈالا گیا لیکن اسے کچھ ہوش نہیں تھا۔

اسے ہوش آیا تو چیخ پکار کا وہی عالم تھا۔ لگتا تھا' وہ وہیں لیاقت آباد کی سڑک پر پڑا ہے لیکن دواؤں کی مخصوص بو بتاتی تھی کہ وہ اسپتال میں ہے اور بینچ پر لیٹا ہوا ہے۔ اس نے چیخ کر کہا۔ "میں کہاں ہوں؟ خدا کے لئے مجھے عباسی شہید اسپتال لے چلو۔"

ایک شیریں آواز نے جواب دیا۔ "تم عباسی شہید اسپتال میں ہی ہو اس وقت۔"

اس کے جسم میں جیسے بجلی سی بھر گئی' وہ تیزی سے اٹھ بیٹھا۔ کسی نے دھکیل کر

اسے پھر لٹا دیا۔ "کہاں جا رہے ہو؟"

کسی نے سرگوشی میں کہا۔ "سر کی چوٹ ہے نا' دماغ کے لئے خطرناک بھی ثابت ہو سکتی ہے۔"

"میرا دماغ بالکل ٹھیک ہے۔" وہ پاگلوں کی طرح چلایا اور پھر اٹھنے لگا۔

"تم جا کہاں رہے ہو؟" پہلی آواز نے پوچھا۔

"میٹرنٹی وارڈ.......... لیبر روم۔"

"دماغ پر اثر ہو گیا ہے۔" ایک سرگوشی ابھری۔

"میرے دماغ کو کچھ نہیں ہوا ہے۔" وہ پھر چلایا۔ "میری بیوی لیبر روم میں تھی۔" پھر اسے جیسے کچھ یاد آیا۔ "ارے میری دوائیں کہاں ہیں؟ قمرن کے لئے دوائیں لے کر آیا تھا' مجھے وہ دوائیں پہنچانی ہیں۔"

"سنو! تم بہت زخمی ہو۔ اس وقت دماغ پر زور مت دو۔" پہلی آواز نے کہا۔ "ہم تمہاری بیوی کے متعلق معلوم کرا لیں گے۔"

اچانک اسے احساس ہوا کہ اسے کچھ نظر نہیں آ رہا ہے۔ "خدا کے لئے میری آنکھیں تو صاف کر دو۔ شاید خون کی وجہ سے کچھ نظر نہیں آ رہا ہے مجھے.........."

"آنکھیں تو تمہاری صاف کر دی گئی ہیں شاید سر کی چوٹ کی وجہ سے روشنی کم ہو گئی ہے۔ ہم ٹسٹ کرتے ہیں.........."

لیکن اس وقت اسے قمرن کے سوا کچھ یاد نہیں تھا۔ بات اس کی سمجھ میں نہیں آئی۔ "جہنم میں گئیں آنکھیں' مجھے لیبر روم لے چلو۔"

"سنو ہم تمہاری بیوی کے متعلق معلوم کرا دیں گے۔ تمہیں آرام کی.......... علاج کی ضرورت ہے۔ سر کی چوٹ تمہاری بینائی پر اثر انداز ہوئی ہے۔ ہمیں معائنہ کرنے دو پلیز۔" پہلی مہربان آواز نے کہا۔

"نہیں۔ پہلے قمرن.......... میں بالکل ٹھیک ہوں۔"

پہلی آواز سے کسی نے کہا۔ "ٹھیک ہے' اسے لیبر روم لے جا کر بیوی دکھا دو اور ساتھ ہی واپس لے آنا۔"

اب تیسری آواز سنائی دی۔ جھنجلاتی ہوئی آواز۔ "یہاں کہرام مچا ہوا ہے' ڈاکٹر۔ آپ بھی کمال کرتے ہیں۔ بے کار کے نخرے۔ زخمی ہیں کے آئے چلے جا رہے ہیں اور آپ مجھ سے کہتے ہیں.........."

"جاؤ' لے کر جاؤ اسے اور ساتھ ہی واپس لے آنا۔" پہلی آواز نے سخت لہجے میں کہا۔

کسی نے بڑی سختی سے اس کا ہاتھ پکڑا اور تقریباً گھسیٹ کر اسے لے چلا۔ راستے میں وہ کئی لوگوں سے ٹکرایا۔

"رک جاؤ یہیں' لیبر روم آ گیا۔" نئی آواز نے بے زاری سے کہا۔ "اپنی بیوی کا نام بتاؤ' میں پوچھ کر آتا ہوں۔"

"قمرن.......... قمرالنسا۔"

"یہیں کھڑے رہو' میں ابھی آیا۔"

انتظار کے ان لمحوں میں بھی حقیقت اس پر نہ کھلی۔ وہ یہی سمجھ رہا تھا کہ اس کی آنکھوں میں سر سے بہہ کر آنے والا خون بھرا ہوا ہے۔ اسے فکر تھی قمرن اور نومولود کی۔ اب تک اسے ایک لمحے کے لئے بھی خیال نہیں آیا تھا کہ وہ زیبا کو روتا چھوڑ کر آیا ہے۔

بڑھتے ہوئے قدموں کی چاپ قریب آ کر رک گئی اور ہمدردانہ لہجے میں کہا گیا۔ "ڈاکٹر شبانہ خود آئی ہیں تمہیں بتانے۔"

"آئی ایم سوری مسٹر نجم۔" جانی پہچانی آواز سنائی دی۔ "آپ کے ہاں بیٹا پیدا ہوا تھا لیکن مجھے افسوس ہے' میں دونوں میں سے ایک کو بھی نہیں بچا سکی۔ شاید.......... شاید وہ دوائیں مل جاتیں تو.........."

نجم الحسن کی ٹانگیں جواب دے گئیں۔ وہ کٹے ہوئے درخت کی طرح ڈھے گیا اور چند لمحوں بعد ہوش و حواس بھی اس کا ساتھ چھوڑ گئے۔ ہوش آیا تو وہ بستر پر تھا۔ اس کے ذہن میں پہلا خیال جو آیا وہ یہ تھا کہ قمرن مر چکی ہے اور اس کا نومولود بیٹا بھی مر چکا ہے۔ اسے جا کر انہیں دیکھنا ہے۔ ان کی تدفین کا بندوبست کرنا ہے۔ پھر اسے زیبا کا خیال آیا۔ معاً اسے تاریکی کا احساس ہوا۔ اس نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے کی کوشش کی لیکن بے

سود.......... اس کے منہ سے چیخ نکل گئی۔

"کیا ہوا؟" کسی نے پوچھا۔

"مم.......... مجھے.......... مجھے کچھ نظر نہیں آ رہا.........."

کچھ دیر خاموشی رہی پھر جواب ملا۔ "مجھے افسوس ہے۔ سر کی چوٹ آپ کی بینائی لے گئی ہے۔"

اس کے سارے وجود میں سناٹے سے تیر گئے' اس نے سوچا' ہر کوئی اظہارِ افسوس کر رہا ہے' مجھے افسوس ہے' میں دونوں میں سے ایک کو بھی نہ بچا سکی۔ مجھے افسوس ہے' آپ دیکھ نہیں سکتے.......... تو میں اندھا ہو گیا؟ میری دنیا اندھیر ہو گئی؟ میرا سب کچھ لٹ گیا؟ اب ننھی زیبا کے سوا کچھ بھی نہیں ہے' میرے پاس.......... وہ گھبرا کر اٹھ بیٹھا۔

"کہاں جا رہے ہو؟" کسی نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھا۔

"مجھے بہت کام کرنے ہیں۔" اس نے سرد لہجے میں کہا۔ "مجھے اپنی قمرن اور اپنے بچے کو گھر لے کر جانا ہے اور پھر انہیں رخصت کرنے کا بندوبست کرنا ہے۔ بہت کام ہیں مجھے' میرے پاس یہاں لیٹنے کی فرصت نہیں.........."

"لیکن اس حال میں.........."

"مجھے تو جو ہونا تھا' ہو چکا ہے۔ اب اور کچھ نہیں ہو گا۔ کچھ نہیں ہو سکتا۔" وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

"اچھا ذرا دیر رک جاؤ۔" ڈاکٹر نے کہا۔ "میں ایمبولینس منگواتا ہوں۔ تمہیں اپنی بیوی بچے کی لاش کو اسی میں لے جانا ہو گا۔"

کچھ دیر بعد وہ ایمبولینس میں چادروں میں لپٹی ہوئی لاشوں کے ساتھ بیٹھا تھا۔ وہ اس کے کچے مکان کے سامنے رکی تو سورج غروب ہو چکا تھا لیکن اب اسے روشنی کی ضرورت تھی نہ پروا۔ وقت جیسے ساکت ہو گیا تھا۔ ہر چیز ٹھہر گئی تھی۔ بس اس کے وجود میں ایک مشین سی تھی جو چل رہی تھی اور اسے چلا رہی تھی۔ عشاء کی نماز کے بعد نماز جنازہ پڑھائی گئی۔ لوگ اس سے تعزیت کرنے لگے لیکن وہ خاموش تھا۔ اس کی بے نور آنکھوں سے آنسو کا ایک قطرہ بھی نہ ٹپکا۔ قبرستان جاتے ہوئے وہ کبھی بیوی کے جنازے

کو کاندھا دیتا اور کبھی بچے کو ہاتھوں پر اٹھا لیتا۔ کسی نے اس کے کاندھے تھامے ہوئے تھے۔

تدفین کے بعد واپس آتے ہوئے بھی وہ اپنے آپ میں گم تھا۔ وہ سوچ رہا تھا' اچھا ہی ہوا کہ آنکھیں چھن گئیں۔ میں نے قمرن کو مرنے کے بعد نہیں دیکھا۔ اب عمر بھر میرے تصور میں جیتی جاگتی قمرن چھم چھم کرے گی اور بیٹے کا دکھ بھی نہیں ہو گا۔ وہ تو جیسے تھا ہی نہیں۔ میں نے اسے دیکھا جو نہیں' چلو اچھا ہوا۔ آنکھیں ہوتیں تو کیا اچھا ملتا دیکھنے کو..........

اور وہ ایسا اندھا تھا' جسے قدرت نے قسمت کی اس محرومی پر ماتم کرنے کی' خود کو آہستہ آہستہ اس محرومی کا عادی بنانے کی مہلت بھی نہیں دی تھی۔ اسے تو اندھا ہونے کے محض چند گھنٹے کے بعد اپنی بیوی.......... اپنے نومولود اَن دیکھے بیٹے کے جنازے کو کندھا دینا پڑا تھا۔

وہ سوچ رہا تھا' میرے لئے اندھے پن کی زندگی کچھ مشکل نہیں ہو گی۔ میں نے تو پہلے ہی دن بہت کچھ سیکھ لیا ہے۔

رسم دنیا کے مطابق ایک پڑوسی نے موت کے گھر کے لئے کھانے کا بندوبست کیا تھا۔ لوگ کھانا کھانے بیٹھے تھے تو اس کی دل جوئی کرنے.......... اسے کھلانے کی کوشش کر رہے تھے لیکن وہ انہیں جھڑکتا رہا۔ زیادہ اصرار پر وہ آپے سے باہر ہو گیا۔ "نہیں چاہئے مجھے کسی سے کچھ۔" وہ چلایا۔ "ہمدردی بھی نہیں چاہئے۔"

لوگ ایک دوسرے کو اشارے کرتے رہے۔ دبی زبان میں باتیں کرتے رہے۔ ایک دن میں اتنے صدمے! دماغ الٹ گیا ہے بے چارے کا۔ اللہ صبر دے دے ٹھیک ہو جائے گا۔ ایک صغریٰ تھی جس سے وہ بات کر رہا تھا۔ اس کا تو احسان تھا اس پر۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ زیبا کو کیسے سمجھائے گا۔ اسے تو یہ بھی نہیں معلوم تھا کہ بچی پر کیا گزر رہی ہے لیکن زیبا نے اس سے کچھ نہیں پوچھا۔ اس کی وجہ وہ سمجھ نہیں پایا' صغریٰ نے بہت اچھی طرح زیبا کو سمجھا دیا تھا کہ وہ کبھی روئے گی' ضد کرے گی' امی سے ملنے کو کہے گی تو ابا کو بہت تکلیف ہو گی' ابا کو نظر بھی نہیں آتا ہے۔ بچی کچھ سمجھی ہو یا نہیں' وہ

روئی نہ ماں کے لئے ضد کی۔

لوگوں نے سوچا تھا' ایک دن میں اتنے صدمے! دماغ الٹ گیا ہے بے چارے کا۔ اللہ صبر دے دے گا' سب ٹھیک ہو جائے گا' لیکن نجم الحسن کو صبر تو آ گیا مگر وہ ٹھیک نہیں ہوا۔ اس نے زیبا اور صغریٰ کے سوا کبھی کسی سے بات نہیں کی' کبھی کسی جاننے والے سے.......... بلکہ کسی سے بھی کچھ نہیں مانگا۔ کوئی بات کرتا تو وہ خاموش رہتا' کوئی جواب نہ دیتا اور کوئی پیچھے پڑ جاتا تو اسے جھڑکتا' گالیاں بکنے لگتا۔

کوئی ہمدردی اور رحم کا کتنا ہی مستحق ہو' اس کا پاگل پن اور چڑچڑا پن زیادہ عرصہ تک کوئی نہیں برداشت کرتا۔ یہ تو غریب لوگ بھی برداشت نہیں کرتے جو سب کچھ برداشت کر لیتے ہیں۔ چنانچہ صغریٰ خالہ کے سوا بستی کا ہر شخص اس سے دور ہوتا گیا۔

کسی کو نہیں معلوم تھا کہ قیامت کی اس رات سوئی ہوئی زیبا کو اپنے گلے سے لگا کر نجم الحسن نے اعلانِ جنگ کیا تھا۔ "میں نے تجھے پکارا' تجھ سے مدد مانگی' رحم مانگا۔" اس نے آسمان کی طرف منہ اٹھا کر کہا تھا۔ "تُو نے مجھے راستہ دلانے کے بجائے مجھ سے آنکھوں کی روشنی چھین لی۔ میں نے بیوی کی صحت مانگی تُو نے اسے اور بچے کو موت دے دی۔ اب اندھے پن نے میرے کندھوں کو کمزور کر دیا ہے اور مجھے اس چھوٹی بچی کا بوجھ بھی اٹھانا ہے۔ مجھے تُو نے ہی زندگی کی خوشیاں دی تھیں اور آج تُو نے ہی مجھ سے سب کچھ چھینا ہے.......... جا' اب تجھ سے کچھ نہیں مانگوں گا۔ آج سے تیری میری لڑائی۔ اب کبھی آواز نہیں دوں گا تجھے۔"

کہتے ہیں نیند سُولی پر بھی آ جاتی ہے۔ نجم الحسن کو بھی آ گئی' زیبا اس کے سینے سے لپٹی سو رہی تھی لیکن وہ اسے نظر نہیں آ رہی تھی' کچھ بھی نظر نہیں آ رہا تھا۔ یہ بھی علم نہیں تھا کہ رات تھی یا دن نکل آیا۔ اس نے زور زور سے اپنی آنکھیں ملیں پھر اس کے سینے میں درد اٹھا۔ اسے یاد آیا کہ اب وہ اندھا ہے۔ اس نے سوچا تھا کہ پہلے ہی دن اس نے اتنا کچھ سیکھ لیا ہے کہ اسے اپنے اندھے پن سے کوئی پریشانی نہیں ہو گی لیکن زیبا کو پلنگ پر لٹا کر وہ اندازے سے لیٹرین کی طرف بڑھا تو راستے میں پڑی بالٹی سے ٹکرا گیا۔ اندھی بے بسی کا احساس اس کے وجود کو کاٹتا چلا گیا۔ لیٹرین میں ٹٹول کر دروازے کی

کنڈی لگائی پھر پیروں سے ٹٹول کر بیٹھا......... باتھ روم سے نکل کر اس نے منہ ہاتھ دھویا تو زیبا جاگ گئی۔ اس نے دو تین بار پکارا۔ "امی......... امی........." پھر اچانک ہی وہ سہم کر خاموش ہو گئی جیسے اسے صغریٰ نانی کی سمجھائی ہوئی باتیں یاد آ گئی تھیں۔ اسے امی کو کبھی نہیں پکارنا تھا۔ ابا کو نظر نہیں آتا تھا' وہ چپکے چپکے بے آواز رونے لگی۔

نجم الحسن نے اس کی پکار سن لی تھی اور آواز کی گھٹن کو بھی محسوس کر لیا تھا۔ وہ پلنگ کی طرف بڑھا اور زیبا کو بانہوں میں بھر لیا۔ "میری بیٹی......... میری زیبا۔"

اسے احساس ہوا کہ بچی کا جسم لرز رہا ہے۔ اس نے اس کے رخساروں کو چھوا' وہاں آنسو بہہ رہے تھے۔ اس نے بچی کو سینے سے لگا لیا۔ "نہ رو میری بیٹی' نہ رو۔ میں خود تیرا منہ دھلا دوں گا۔" زیبا لیٹرین سے آئی تو اس نے بڑی محبت سے اس کا منہ دھلایا۔ تھوڑی دیر بعد صغریٰ ناشتا لے آئی۔ چائے تھی' پاپے تھے۔ نجم الحسن نے کوئی اعتراض نہیں کیا' بس اتنا کہا۔ "خالہ مجھے تو خواہش نہیں ہے۔"

صغریٰ کے اشارے پر زیبا بولی۔ "بابا میں بھی نہیں کھاؤں گی۔"

"کیسے نہیں کھائے گی! میں خود کھلاؤں گا اپنی بیٹی کو۔" یہ کہہ کر اس نے پاپا چائے میں بھگو کر اس کی طرف بڑھایا۔

"بیٹا نجمی' تو بھی کچھ کھا لے۔" صغریٰ نے ڈرتے ڈرتے کہا۔

"نہیں خالہ' مجھے واقعی خواہش نہیں ہے۔"

صغریٰ کے اشارے پر زیبا نے پاپا چائے میں بھگو کر اس کے ہونٹوں کی طرف بڑھایا۔ "بابا کھا لیں نا!" اس کے لہجے میں سچی التجا تھی۔ نجم الحسن نے ہتھیار ڈال دیئے۔

صغریٰ جانے لگی تو نجم الحسن نے جیب میں ہاتھ ڈال کر نوٹ نکالے اور کہا۔ "خالہ' یہ لیتی جاؤ۔"

صغریٰ نے پلٹ کر دیکھا۔ اسے لگا' نجم الحسن نے اس کے منہ پر تھپڑ مار دیا ہے لیکن وہ بہت سمجھ دار عورت تھی۔ نجم الحسن کی ذہنی کیفیت کسی حد تک اس کی سمجھ میں آ گئی۔ وہ یہ بھی سمجھ گئی کہ اسے ایک سچی نیکی' مسلسل نیکی کا موقع مل رہا ہے۔ ایسی نیکی جس کے لئے اسے ذلتیں بھی اٹھانی پڑیں گی۔

وہ پلٹ کر آئی اور نجم الحسن کے ہاتھ سے نوٹ لے لئے۔ "میں سمجھ گئی' تم احسان لینا نہیں چاہتے حالاں کہ یہ احسان نہیں' بیٹے! تم بس مجھ سے ناراض نہ ہونا۔ تم جیسا کہو گے میں ویسا ہی کروں گی۔"

نجم الحسن کی آنکھیں بھیگ گئیں۔ "خالہ' زیبا کے علاوہ ایک تم ہی ہو دنیا میں جس سے میری لڑائی نہیں۔ کچھ دن پہلے میں تمہیں جانتا بھی نہیں تھا پر تم مجھے بہت اپنی لگتی ہو' ماں جیسی۔ بس مجھ سے بحث نہ کرنا۔ بہت کڑوا......... زہریلا ہو گیا ہوں میں۔"

"میں تجھ سے کبھی کچھ نہیں کہوں گی نجمی۔ دوپہر کو میں کھانا لاؤں گی اور ہاں یہ پیسے تو بہت سارے ہیں۔"

"رکھ لو خالہ' ابھی تو مجھے کچھ بھائی نہیں دیتا۔ بہت کچھ سوچنا ہے مجھے۔"

وہ کئی دن تک سوچتا رہا۔ اسے کچھ کرنا تھا' آنکھوں سے محرومی کو بھی مدِ نظر رکھنا تھا۔ اس کے پاس جو دو ہزار روپے تھے وہ تقریباً ختم ہو چکے تھے۔ کچھ خریداری کی تھی' گھر میں لگائے تھے۔ بچے ہوئے پیسوں میں قمرن کے کفن دفن کا بندوبست بھی ہوا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ قمرن کا کام پرائے پیسے سے ہو۔ اس پر وہ محلے والوں سے بہت لڑا تھا۔ سب سے نمٹ کر اس کے پاس چار سو سے کچھ زائد روپے رہ گئے تھے۔ ان میں سے دو سو اس نے صغریٰ کو دے دیئے تھے' دو سو سے کچھ اوپر اس کی جیب میں تھے۔ اسے ان پیسوں میں ہی کچھ کرنا تھا مگر کیا؟ ناپ تول کی کوئی چیز بیچنا ممکن نہیں تھا۔

سوچتے سوچتے اس کے تصور میں ایک منظر لہرا گیا۔ جو سڑک اس کے گھر تک آتی تھی وہ مڑ کر چاندنی چوک کی طرف جاتی تھی۔ یہ مقامِ اتصال وہ جگہ تھی۔ اس نے تصور کی نگاہوں سے دیکھا کہ بہت سے بچے واٹر بال کا ربر اپنے انگلی میں باندھے اس سے کھیل رہے ہیں۔ وہ گیند کو نیچے کی' آگے کی سمت دھکیلتے' انگلی میں بندھے ربر کے زور پر گیند آگے یا نیچے جاتی اور پلٹ کر آتی تو وہ اسے کیچ کرتے اور پھر دھکیل دیتے۔ اس نے فیصلہ کر لیا کہ وہ وہاں کھڑا ہو کر واٹر بال بیچے گا۔ اس کام میں زیادہ پیسے کی ضرورت بھی نہیں ہو گی۔ بس ایک پمپ خریدنا ہو گا اور ربر کی گیندیں۔ یہ فیصلہ کر کے پہلی بار اسے کچھ طمانیت ہوئی۔

صغریٰ اکیلی عورت تھی۔ ۷۲ء میں مشرقی پاکستان سے لٹ پٹ کر پاکستان آئی تھی۔ اس کے شوہر اور چار بیٹوں کو مکتی باہنی والوں نے شہید کر دیا تھا اور دو بیٹیوں کو اٹھا کر لے گئے تھے۔ اس کے بعد ان کا کچھ پتہ نہیں چلا تھا۔ صغریٰ نے مردہ سمجھ کر انہیں صبر کر لیا تھا۔ وہ کراچی آ گئی۔ وہ بنگلہ دیش بننے کے بعد کا ابتدائی زمانہ تھا۔ لوگ ان پاکستانیوں کا بڑا احترام کرتے تھے، جنہوں نے بنگلہ دیش میں ناچتی موت کے سامنے بھی پاکستان کے پرچم اور تصور سے دست بردار ہونے سے انکار کر دیا تھا۔ ایسا ہی ایک شخص اسے وزیر اعلیٰ کے پاس لے گیا۔ وزیر اعلیٰ کی مہربانی سے اسے اس کچی آبادی میں سر چھپانے کا ٹھکانہ مل گیا۔ محنتی تھی۔ اس علاقے میں دو تین گھروں میں جھاڑو برتن کا کام مل گیا۔ روکھی سوکھی چلنے لگی۔

دکھوں کا سمندر پار کر کے آنے والی صغریٰ کو نجم الحسن کے دکھ اور اذیت کا پوری طرح احساس تھا۔ وہ خود اب تک بے مقصد جیتی رہی تھی لیکن اسے لگتا تھا کہ اپنے چار بیٹوں کے بدلے ایک بیٹا مل گیا ہے۔ معذور بیٹا اور ننھی سی پوتی۔ قمرن کی موت کے روز تو اس نے کام سے چھٹی کر لی تھی۔ اگلے روز اس نے یہ معمول بنایا کہ صبح ناشتہ کے ساتھ نجمی اور زیبا کے لئے کھانا بھی تیار کرتی اور دے کر چلی جاتی۔ وہ خود دوپہر کا کھانا اس گھر میں کھاتی تھی جہاں اس وقت کام کرتی تھی۔ شام کو واپس آتی تو رات کا کھانا پکا لیتی۔

اس صبح وہ ناشتا اور کھانا لے کر آئی تو نجم الحسن نے اسے روک لیا۔ ”خالہ، ایک کام کرو گی میرا؟“

”کیوں نہیں بیٹا؟“

”آج شام کو مجھے باہر لے چلنا، کسی اسٹور پر جہاں ربڑ کی گیندیں اور پمپ خرید سکوں..........“

”ضرور لے چلوں گی بیٹا۔“

پمپ اسّی روپے میں آیا۔ ہزار گیندوں کا تھیلا سو روپے میں ملا۔ نجم الحسن کی جیب خالی ہو گئی مگر اس رات وہ بڑے سکون سے سویا۔

اگلی صبح ناشتے کے بعد صغریٰ نے اس کے لئے انتظامات کئے۔ زیبا کو گزشتہ روز اس

نے جگہ بھی دکھا دی تھی اور سب کچھ سمجھا دیا تھا۔ نجم الحسن نے بہت ساری گیندیں تیار کیں، انہیں پتلے ربڑ سے باندھ کر ربڑ کے سرے بالٹی پر لٹکائے اور گیندوں کو پانی سے بھری ہوئی بالٹی میں ڈال دیا۔ بغیر بھری گیندوں کا تھیلا اور پمپ اس نے کپڑے کے ایک بڑے تھیلے میں رکھ لیا۔ ننھی زیبا کے ہاتھ میں ایک چادر تھی۔

انہوں نے ایک دیوار کے ساتھ چادر بچھا کر اس پر اپنی چھوٹی سی دکان لگائی۔ نجم الحسن نے ایک واٹر بال کو اپنی انگلی میں باندھا اور اسے مخصوص انداز میں تیز تیز اچھالنے لگا۔ ساتھ ہی وہ پکار رہا تھا۔ ”آؤ بچو، واٹر بال آٹھ آنے میں.......... آٹھ آنے..........“

بچے جمع ہونے لگے۔ گیندیں بکنے لگیں۔ زیبا بیٹھی تماشا دیکھتی رہی۔ صغریٰ نے کھانا باندھ کر دیا تھا۔ وہیں بیٹھ کر انہوں نے کھانا کھایا اور جب ہر طرف دوپہر کا سکوت طاری ہو گیا تو نجم الحسن کو اندازہ ہوا کہ اب دھندا شام کو ہی شروع ہو گا۔ اس نے واپس جانے کے بارے سوچا۔ گھر جا کر ڈیڑھ دو گھنٹے آرام کیا جا سکتا تھا لیکن اس کے لئے اتنی دور، اتنا سامان اٹھا کر آنے جانے کی مشقت! یہ بہت منگا سودا تھا، سو وہ وہیں بیٹھا رہا۔ شام چار بجے کے بعد بچوں کے قہقہے اور بھاگتے قدموں کی چاپیں پھر بیدار ہوئیں۔ دو گھنٹے میں اچھی خاصی گیندیں بکیں۔ چھ بجے انہوں نے دکان بڑھائی اور گھر کی طرف چل دیئے۔

پھر روز کا معمول بن گیا۔ وہ صبح ناشتہ کرتے، نو بجے گھر نکلتے، دکان لگاتے، دوپہر کا کھانا کھاتے، پھر فرصت ہوتی تو وہ بالٹی کا جائزہ لیتا اور نئی گیندیں بھرتا کبھی بکری اچھی ہوتی تو گیندیں درمیان میں ہی بھرنی پڑ جاتیں۔ شام چھ بجے واپسی ہوتی۔ اوسطاً ہر روز اس کی سو گیندیں بک رہی تھیں۔ یعنی پچاس روپے آمدنی۔ اس نے حساب لگا کر طے کر لیا کہ اسے اپنی آمدنی کا چالیس فی صد تو کاروبار جاری رکھنے کے بچانا ہو گا۔ گیندیں ختم ہو جانے پر گیندیں خریدنی ہوں گی۔ ربر خریدنے ہوں گے۔ کسی بھی وقت کسی بھی چیز کی قیمت بڑھ سکتی ہے، کبھی پمپ بھی خراب ہو سکتا ہے۔ چالیس فی صد میں یہ معاملات نمٹ سکتے تھے۔ اس نے اس بچت کو اوسط پر فکس کر لیا۔ یعنی ہر روز بیس روپے۔ آمدنی فکس نہیں تھی۔ کسی روز ساٹھ گیندیں بکتیں یعنی تیس روپے کی آمدنی، اس میں سے بھی وہ بیس روپے الگ رکھ لیتا، دس روپے میں اپنا کام چلاتا۔ کسی روز آمدنی ستر اسّی بھی ہو جاتی تب

بھی وہ بیس روپے الگ کر لیتا۔ وہ باقی پیسے صغریٰ کو دیتا۔ صغریٰ ہر روز احتجاج کرتی۔

"دیکھو خالہ' تم نے وعدہ کیا تھا کہ مجھ سے بحث کبھی نہیں کرو گی۔"

"یہ تو ہے لیکن........."

"لیکن ویکن کچھ نہیں خالہ' میں اپنے گھر کا خرچہ دے رہا ہوں۔"

صغریٰ کو خاموش ہو جانا پڑتا لیکن جس روز نجمی نے باون روپے دیئے اس روز وہ چپ نہ رہ سکی۔ "نجمی معلوم ہے یہ کون سا مہینہ ہے؟"

"نہیں خالہ مجھے تو دنوں اور تاریخوں کا بھی مشکل ہی سے پتا چلتا ہے اور مجھے فرق بھی کیا پڑتا ہے!"

"یہ رجب کا مہینہ ہے نجمی۔"

"تو مجھے کیا؟"

"رجب کے بعد شب برات اور پھر رمضان........."

"تو پھر؟"

"رمضان کے بعد عید آتی ہے۔"

"اوہ!" نجمی لمحے بھر کو چونکا پھر اس نے سرد آہ بھر کر کہا۔ "خالہ' اب ہماری کیا عید بقر عید۔"

"چل تیری نہ سہی زیبا کی تو ہو گی' اس کے تو نئے کپڑے بنیں گے نا!"

"ہاں یہ تو ہے۔" نجمی نے کہا اور سوچ میں پڑ گیا۔ اس نے تصور میں دیکھا' عید کا دن ہے۔ بچے رنگ برنگے نئے کپڑے پہنے عیدی ملنے والے پیسوں سے جیب اور چھوٹے چھوٹے رنگین پرس بھرے گلی گلی پھر رہے ہیں۔ آئس کریم کھاتے' رنگ برنگے غبارے اڑاتے' ایسے میں اس کی زیبا.........

"اس کے لئے ابھی سے بچت کرنا شروع کر دے نجمی۔" خالہ نے اسے چونکا دیا۔

"دیکھ تیرے اور بچی کے کھانے کا خرچ کچھ زیادہ نہیں۔ دس روپے اور حد سے حد پندرہ روپے کافی ہیں۔ اس کے بعد جو بچے اسے جوڑنا شروع کر دے تاکہ رمضان تک عید کا خرچا نکل آئے۔"

بات نجمی کی سمجھ میں آ گئی۔ اب وہ دو طرح کی بچت کرتا تھا۔ اگلی بار وہ صغریٰ کے ساتھ گیندیں اور ربڑ خریدنے گیا تو اس نے جیبوں والے دو بنیان خرید لئے۔ اب ایک جیب میں کاروباری بچت ہوتی تھی تو دوسری جیب میں ذاتی بچت۔ دونوں جیبوں کے نوٹوں میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔

دفتر سے ایک روز چپراسی افضل اس کی خیریت دریافت کرنے آیا۔ وہی افضل جس سے نجمی نے کچا مکان خریدا تھا۔ اس نے بتایا کہ دفتر والے اس کی بغیر اطلاع غیر حاضری سے پریشان ہیں لیکن وہ خود نجمی کے المیے کے متعلق جان کر سناٹے میں رہ گیا تھا۔

"میں ڈائریکٹر صاحب کو آپ کے بارے میں بتاؤں گا۔ مجھے یقین ہے وہ آپ کے لئے کوئی کام ضرور نکالیں گے۔" افضل نے کہا۔

"نہیں افضل' میں اب تو کھوٹے سکے کی مانند ہوں۔ میں اب کسی کام کا نہیں رہا۔"

"لیکن کوئی کام مل جائے تو حرج ہی کیا........."

نجمی نے تیزی سے اس کی بات کاٹ دی۔ "افضل اگر تمہیں مجھ سے ہمدردی ہے تو میری بات مان لو' مجھ سے وعدہ کرو کہ میرے متعلق کسی کو کچھ نہیں بتاؤ گے۔ کہہ دینا کہ گھر چھوڑ کر نہ جانے کہاں چلے گئے' کسی کو کچھ پتا نہیں۔"

"لیکن نجمی صاحب۔"

"بس......... مجھے میرے حال پہ چھوڑ دو۔" اس کا لہجہ تلخ ہو گیا۔

افضل کچھ دیر بعد چلا گیا۔ وہ باہر کی دنیا سے نجمی کا آخری رابطہ تھا جو ٹوٹا' اس نے خود توڑا۔

زندگی ایک مخصوص راستے پر چل پڑی تھی' جہاں چھوٹی موٹی اونچ نیچ تو تھی لیکن کوئی بڑا تغیر نہیں تھا۔ وہ اپنے مخصوص وقت پر آتا' پانی کی گیندیں بیچتا اور مخصوص وقت پر گھر کا رخ کرتا۔ ننھی زیبا گھر کے رستے سے خوب واقف ہو گئی تھی۔

زندگی کا اب کوئی بڑا مقصد نہیں تھا۔ بس ایک ہی مقصد تھا......... عید' ننھی زیبا کی عید۔ اس کی آمدنی زیادہ تر سکوں کی شکل میں ہوتی تھی۔ دوسری طرف سامنے پان کی

دکان والے کو ریزگاری کی ضرورت رہتی تھی۔ چنانچہ شام کو جب نجمی اٹھنے والا ہوتا تو پان والا خود آتا اور اس کی ریزگاری کو دس پانچ کے نوٹوں میں بدل دیتا۔ نجمی گھر پہنچ کر ان نوٹوں کے حصے بخرے کرتا۔ پندرہ یا بیس روپے صغریٰ کو دیتا۔ بیس روپے بنیان کی بائیں جیب میں جاتے۔ وہ جیب سرمایہ کاری کی تھی۔ باقی رقم بنیان کی داہنی جیب میں جاتی۔ وہ عید جیب تھی۔ مزید رقم کا اضافہ کرنے کے بعد وہ رقم شمار ضرور کرتا۔ ہر صبح وہ صغریٰ سے پوچھتا۔ "عید میں کتنے دن رہ گئے ہیں خالہ؟" پھر رمضان آ گیا۔ اس وقت اس کے بنیان کی داہنی جانب والی عید جیب میں موجود رقم چار سو سے تجاوز کر چکی تھی۔

زندگی اسی طرح گزرتی جاتی اگر ایک روز صغریٰ کی حالت اتنی نہ بگڑتی۔ پیٹ میں درد کی شکایت اسے خاصے عرصے سے تھی لیکن وہ کسی سے کہتی نہیں تھی۔ کہتی بھی تو کس سے! مگر ایک روز اتنا درد بڑھا کہ اس کی چیخوں نے پورے محلے کو ہلا کے رکھ دیا۔ لوگ جمع ہوئے صغریٰ کو قریبی ڈاکٹر کے پاس لے جایا گیا۔ اس نے اسپتال لے جانے کا مشورہ دیا۔ اسپتال والوں نے صغریٰ کو ایڈمٹ کر لیا' پتا چلا کہ آپریشن ہوگا۔ یوں نجمی بالکل اکیلا ہو گیا۔ زندگی کے معمولات میں بہت فرق پڑ گیا۔ اب وہ ناشتا' دوپہر اور رات کا کھانا چوک کے ایک ہوٹل میں کھاتے لیکن سب سے بڑا فرق یہ پڑا تھا کہ نجمی انسانوں سے بالکل ہی کٹ گیا تھا۔ صغریٰ سے وہ تھوڑی بہت باتیں کر لیتا تھا مگر اس وقت اسے اس گفتگو کی اہمیت کا علم نہیں تھا۔ اب پتا چل رہا تھا کہ انسانوں سے کٹ کر جینا کیا ہوتا ہے اور کسی سے کوئی بات کئے بغیر کئی کئی دن گزار دینے سے اندر کیسے سناٹے اتر جاتے ہیں۔

ایک روز اس نے پان والے کو ریزگاری دیتے ہوئے پوچھا۔ "عید میں کتنے دن رہ گئے ہیں' بھائی؟"

"چھ یا سات دن۔"

نجمی نے فیصلہ کیا کہ عید سے دو دن پہلے زیبا کو بازار لے جائے گا اور سلے سلائے کئی جوڑے دلوائے گا۔ جوتے اور چپلیں بھی خریدے گا اس کے لئے۔ چوک کے راستے میں اور اس طرف والے فٹ پاتھ سے اس کے قدم خوب آشنا تھے۔ وہاں دکانیں ہی

دکانیں تھیں جہاں سے خریداری کی جا سکتی تھی۔ پھر بھی نجمی کو صغریٰ کی کمی محسوس ہوئی' وہ ہوتی تو اچھا رہتا۔

اگلے روز دوپہر کو سکون کے وقفے میں وہ ستا رہا تھا کہ کوئی اس کی طرف چلا آیا۔ آنے والے نے بڑی شائستگی سے اسے سلام کیا اور کہا۔ "پانچ روپے کی اٹھنیاں اور چونیاں مل سکیں گی؟"

نجمی نے اپنی جیب سے ریزگاری نکالی اور بڑی احتیاط سے گن کر اس کی طرف بڑھا دی۔ اجنبی نے پانچ کا نوٹ اس کی طرف بڑھاتے ہوئے شکریہ ادا کیا پھر بولا۔ "ایک بات بتا دوں آپ کو' اب نئے نوٹ جاری ہونے تک سو اور پچاس کے نوٹ مت لیجئے گا۔"

"کیا مطلب؟" نجمی نے حیرت سے پوچھا۔

"آپ کو نہیں معلوم؟ گورنمنٹ نے سو اور پچاس کے نوٹ کینسل کر دیے ہیں۔ آج نوٹ بدلوانے کی آخری تاریخ تھی۔ اب جن لوگوں کے پاس یہ نوٹ ہوں گے ان کی حیثیت ردی کاغذ سے زیادہ نہیں ہوگی۔"

نجمی کے تو پیروں تلے سے زمین نکل گئی۔ اس کی تمام بچت سو اور پچاس کے نوٹوں کی شکل میں تھی۔ اسے ۷۲ء کا تجربہ یاد آ گیا جب نوٹ کینسل ہوئے تھے۔ بینکوں کے باہر نوٹ بدلوانے والوں کی لمبی قطاریں لگی تھیں اور بہت سے لوگ تو نوٹ بدلوا ہی نہیں سکے تھے۔

"کیا بات ہے؟ کیا ہوا آپ کو؟" اجنبی نے پوچھا۔

"مم......... مجھے بھی نوٹ بدلوانے ہیں۔" نجمی نے ڈوبتی آواز میں کہا۔

"نوٹ بدلوانے ہیں؟ لیکن اب تو ایک بج چکا ہے' بینک والے لین دین بند کر چکے' اب کیا ہو سکتا ہے؟"

نجمی پر جیسے بجلی گر گئی۔ اس کے ہاتھ بے اختیار قمیض کے نیچے بنیان کی جیبوں کی طرف گئے اور فوراً ہی واپس آ گئے۔ "اب......... اب کیا ہوگا۔"

"اوہ میں سمجھ گیا۔" اجنبی نے ہمدردانہ لہجے میں کہا۔ "آپ کی پوری کمائی ڈوب رہی ہے لیکن ٹھہریں' برانچ کا منیجر میرا جاننے والا ہے۔ آپ میرے ساتھ چلیں' میں اسے

آپ کی مجبوری اور بے خبری کے متعلق بتا کر قائل کر لوں گا' آپ کے نوٹ بدل جائیں گے۔"

"میں بہت شکر گزار ہوں گا۔"

"تو آئیں میرے ساتھ۔"

نجمی زیبا کو لے کر اجنبی کے ساتھ چل دیا۔ بینک کے سامنے اجنبی نے کہا "آپ یہیں رکیئے۔ بینک بند ہونے کی صورت میں کوئی اندر نہیں جا سکتا۔ میں تو اپنے دوست منیجر کی وجہ سے چلا جاؤں گا۔ میں سعید سے بات کر کے ابھی آتا ہوں۔"

نجمی زیبا کا ہاتھ پکڑ کر فٹ پاتھ پر کھڑا رہا۔ اس کا دل ڈوبا جا رہا تھا۔ ذہن میں ایک سوال ڈنک مارے جا رہا تھا' نوٹ نہ بدلے گئے تو کیا ہوگا؟ تھوڑی دیر بعد اجنبی باہر آیا۔

"میں نے سعید کو رضامند کر لیا ہے' آپ کے نوٹ بدل جائیں گے' کتنے روپے ہیں آپ کے پاس؟"

روز حساب کرنے والے نجمی نے جھٹ کہا۔ "ساڑھے آٹھ سو اور ڈھائی سو.......... گیارہ سو۔"

"لائیں رقم مجھے دے دیں۔" اجنبی نے کہا۔ "میں بدلوا لاتا ہوں۔"

نجمی ایک لمحے کو ہچکچایا پھر اس نے سوچا۔ "یہ نوٹ تو اب ردی کے ٹکڑے ہو چکے ہیں۔ ایک شخص بدلوانے جا رہا ہے تو کیا حرج ہے ورنہ وقت تو گزر چکا۔" اس نے بنیان کی دونوں جیبیں خالی کر دیں۔

"مجھے دس پندرہ منٹ لگیں گے۔ آپ یہیں کھڑے رہیں۔"

نجمی زیبا کا ہاتھ تھامے وہیں کھڑا رہا۔ پندرہ منٹ ہوئے' آدھا گھنٹہ ہوا پھر ایک گھنٹا گزر گیا۔ اجنبی واپس نہیں آیا۔ نجمی کو تشویش ہونے لگی۔ وہ بینک کے گیٹ کی طرف بڑھا۔ "بھائی.......... جو صاحب اندر گئے تھے انہیں بلا دو ذرا۔" اس نے چوکیدار سے کہا۔

"اندر..........؟ اندر تو کوئی نہیں گیا۔" چوکیدار نے سخت لہجے میں کہا۔ "بینک بند ہو چکا ہے۔"

"تمہارے منیجر صاحب کے دوست اندر گئے ہیں۔ وہی مجھے لے کر آئے تھے۔"

"میں کہہ رہا ہوں' اندر کوئی بھی نہیں ہے۔ جاؤ بابا' معاف کرو۔"

نجمی کو غصہ آ گیا کہ چوکیدار اسے بھکاری سمجھ رہا ہے۔ "دیکھو سو اور پچاس کے نوٹ کینسل ہو گئے ہیں نا۔ میں وہ نوٹ بدلوانے آیا ہوں۔ میں جانتا ہوں کہ نوٹ بدلوانے کا وقت نکل چکا ہے مگر مجھے جو صاحب یہاں لائے ہیں وہ تمہارے منیجر سعید صاحب کے دوست ہیں۔ پہلے انہوں نے اندر جا کر سعید صاحب سے بات کی پھر مجھ سے نوٹ بدلوانے کے لئے لے گئے۔ تم انہیں بلا دو مہربانی کر کے۔"

"او بابا' کہاں کی ہانک رہے ہو تم۔" چوکیدار کا لہجہ اور سخت ہو گیا۔ "کوئی نوٹ کینسل نہیں ہوا۔ نہ بینک نوٹ بدل رہا ہے اور ہمارے منیجر کا نام بھی سعید نہیں شہاب الدین ہے' اور اندر کوئی بھی نہیں ہے۔"

"کیا کہہ رہے ہو..........؟"

چوکیدار کا لہجہ ایک دم نرم ہو گیا۔ "کتنی رقم دی تھی اسے؟"

"گیارہ سو تھے۔" نجمی نے ڈوبتی آواز میں کہا۔

"بس تو اب صبر کر لو۔" چوکیدار نے کہا۔

زندگی میں دوسری بار ایسا ہوا کہ نجمی کی ٹانگوں میں جان نہ رہی۔ وہ وہیں فرش پر بیٹھ گیا۔ ننھی زیبا اس کے پاس بیٹھ کر اس کے دونوں ہاتھ تھامے پوچھ رہی تھی۔ "کیا ہوا بابا؟"

"کچھ نہیں بٹیا' ہم پھر لٹ گئے۔" اس نے بڑی مشکل سے کہا۔

لوگ جمع ہو گئے۔ ہر شخص اس سے ایک ہی سوال پوچھ رہا تھا' کیا ہوا؟ وہ بار بار بتاتا رہا' بتاتے بتاتے تھک گیا۔ اس کے سوا کچھ حاصل نہ ہوا کہ لوگ اس نوسرباز کو برا بھلا کہتے رہے لیکن اس سے اس کی رقم تو نہیں مل سکتی تھی۔ لوگ اپنے راستے ہو لئے' وہ زیبا کے ساتھ وہیں بیٹھا رہا۔ چوکیدار اپنے اسٹول پر جا بیٹھا تھا۔ آخر کار اس نے زیبا سے کہا۔ "چلو بٹیا.........."

وہ اپنے ٹھکانے پر پہنچے تو پتہ چلا کہ ان پر کوئی آخری وار بھی کر چکا ہے۔ اس کی

بالٹی' واٹر بالز اور پمپ اور بغیر بھری گیندوں کا تھیلا غائب تھا۔ بس چادر موجود تھی جس کے چاروں کونوں پر پتھر رکھے ہوئے تھے۔ وہ خاموشی سے بیٹھ گیا۔ اس نے زیبا کا سر اپنے زانو پر رکھ لیا اور آسمان کی طرف منہ کر کے خلاؤں میں گھورنے لگا۔ اس کی ذہن میں صرف ایک ہی خیال تھا اور وہ یہ کہ اس کے پاس صرف پانچ روپے ہیں اور کچھ ریز گاری ہے اور سامنے پہاڑ سی زندگی ہے۔ اسے پتا بھی نہیں چلا کہ شام ہو گئی ہے۔ اس نے ان سکوں کی کھنکھناتی آواز بھی نہ سنی جو راہ گیر چادر پر اچھالتے جا رہے تھے۔ اس نے بچی کی مسلسل فریاد بھی نہ سنی.......... "بابا' بھوک لگ رہی ہے۔ بابا بہت بھوک لگی ہے۔" اس کی تمام حسیات سامنے منہ پھاڑے کھڑے مسائل کا حل سوچنے پر مرکوز تھیں مگر اسے کوئی حل سجھائی نہیں دیا۔ روانگی کا وقت آیا' اس نے بھوک سے نڈھال بیٹی کو چمکار کر کہا۔

"چلو بٹیا گھر چلیں۔" اس نے چادر اٹھائی تو اس پر پڑے ہوئے سکے زمین پر گر گئے۔ "بابا پیسے گر گئے ہیں۔" زیبا نے کہا۔

"ہمارے نہیں ہیں بٹیا۔" اس نے بے دھیانی سے کہا۔

اس روز گھر واپس جاتے ہوئے وہ سوچ رہا تھا' اب پتہ چلا تہی دست ہونا کیا ہوتا ہے۔ میں ہر روز یہاں آتا تھا' ہر شام سے یہاں جاتا تھا۔ میرے ہاتھ میں ایک بالٹی اور ایک تھیلا ہوتا تھا۔ آج میرے دونوں ہاتھ خالی ہیں۔ اسے کہتے ہیں تہی دست ہونا۔ گھر پہنچ کر وہ سناٹے کی کیفیت میں سوچتا رہا' اب کیا کرے.......... اب کیا ہو؟

"بابا' بہت بھوک لگی ہے۔" زیبا کی روہانسی آواز نے اسے چونکا دیا۔ اسے شاک لگا۔ ارے میری بچی.......... صبح سے بھوکی ہے۔ اس افتاد میں کھانے کا خیال ہی نہیں آیا۔ کون جانے.......... دوپہر سے اب تک کتنی بار پکار چکی ہو اس طرح! "ابھی چلتے ہیں بٹیا۔" اس نے دلاسا دیا اور جیب سے ریز گاری نکال کر گننے بیٹھ گیا۔ پانچ روپے کے نوٹ کے علاوہ اس کے پاس ریز گاری کی شکل میں سوا سات روپے موجود تھے۔ پانچ چھ روپے کھانے میں چلے جاتے۔ اگلی صبح ناشتہ غائب' اس کے بعد ایک وقت کے کھانے کے پیسے اور ہوتے۔ اس نے سوچا پہلا مسئلہ پہلے۔ وہ زیبا کو ساتھ لے کر ہوٹل چلا گیا۔ کھانا کھا کر واپس آنے کے بعد اس نے بچی کو تھپک تھپک کر سلایا اور پھر خود بیٹھا سوچتا رہا' نہ جانے

کب اسے نیند آ گئی۔

اگلی صبح منہ ہاتھ دھونے کے بعد زیبا نے کہا۔ "بابا چلو گے نہیں؟"

"کہاں؟" اس نے بے خیالی میں پوچھا۔

"گیندیں بیچنے۔"

"اب کہاں جائیں گے بٹیا' سب ختم ہو گیا۔" اس نے آہ بھر کر کہا اور بڑی مشکل سے آنکھوں کی طرف بڑھنے والے آنسوؤں کو پیا۔

زیبا خاموش ہو گئی تھی۔ اس نے ناشتے کا مطالبہ بھی نہیں کیا۔ نجمی بیٹھا سوچتا رہا لیکن اس مسئلے کا کوئی حل نہیں تھا اس کے پاس۔ اس نے اپنے پیروں پر کھڑے ہونے کی ایک کوشش کی تھی اور اس سے ایک سبق ہی سیکھا تھا' وہ یہ کہ وہ کبھی اپنے پیروں پہ نہیں کھڑا ہو سکتا' اس کی کھوئی ہوئی بینائی ہمیشہ اس کے راستے میں دیوار بنی رہے گی۔ کوئی بھی شخص کسی بھی وقت اسے بے وقوف بنا کر لوٹ سکتا ہے۔ کیا کام کرے گا وہ؟ اور اب ہے ہی کیا اس کے پاس؟ اسے پتا بھی نہیں چلا کہ دوپہر ہو گئی ہے۔

"بابا' بھوک لگی ہے۔" زیبا نے جھجکتے ہوئے کہا۔

تب وہ چونکا۔ اسے تقدیر پر غصہ آنے لگا' جس نے اسے دوسری بار لوٹا تھا۔ وہ تو بیٹی کے لئے عید کا سامان کر رہا تھا اور اب ایک وقت کے بعد اس کے پاس بیٹی کا پیٹ بھرنے کا آسرا بھی نہیں رہا تھا۔ اس کی آنکھیں پھر جلنے لگیں' ایک بار پھر وہ آنسوؤں کا زہر پی گیا۔ وہ زیبا کو ہوٹل لے گیا۔ اس بار اس نے صرف زیبا کے لئے کھانا منگوایا۔

"بابا آپ نہیں کھا رہے؟" زیبا نے کھاتے کھاتے اچانک پوچھا۔

"نہیں بٹیا' بھوک نہیں ہے مجھے۔"

بچی خاموش ہو گئی مگر چند لمحے بعد اس کا بنایا ہوا چھوٹا سا نوالہ اس کے لبوں کو چومنے لگا۔ "بابا میری قسم کھا لیں نا!"

اس نے خاموشی سے منہ کھول دیا۔ پھر اس نے ایک روٹی اور منگوا لی اور زیبا کے ساتھ چھوٹے چھوٹے نوالے لیتا رہا۔ اس طرح اس نے زیبا کے لئے مزید ایک وقت کے کھانے کے پیسے بچا لئے۔ اس کا خیال تھا کہ اس وقت تک وہ روزگار کی کوئی نہ کوئی

صورت نکال لے گا۔

وہ ایک اور قیامت کی رات تھی اس کے لئے۔ بے بسی کے احساس نے ذہن کو شل کر کے رکھ دیا تھا۔ ہر طرف اندھیرا تھا۔ ہر چند قدم کے فاصلے پر ایک اندھی گلی تھی۔ کہیں کوئی راستہ نہیں تھا۔ کوئی ایسا نہیں تھا' جس سے وہ بات کر سکے۔ ننھی زیبا سو چکی تھی صغریٰ خالہ اسپتال میں تھی۔

صبح زیبا نے ناشتہ کرنے کے بجائے ایک اور ہی فرمائش کی۔ "بابا کام پر چلو۔" اس کے لہجے میں ضد تھی۔ اصرار تھا۔

"کون سا کام بٹیا؟"

"بابا وہ بالٹی......... گیندیں کہاں گئیں؟" زیبا نے بھی اچانک سوال کر دیا۔

وہ سٹپٹا گیا۔ بچی کی حیرانی بجا تھی' اس نے بیٹی کو بتایا جو نہیں تھا کہ ان پر کیا گزر گئی تھی۔

"وہ......... وہ کھو گئیں بٹیا۔" اس نے آخر کار جواب دیا۔

زیبا چند لمحے خاموش رہی پھر بولی۔ "بابا ہم وہیں چل کر بیٹھیں گے' وہاں بیٹھنا اچھا لگتا ہے۔ بچے کھیلتے ہیں' وہ ہمارے پاس آتے ہیں۔"

وہ کیسے بتاتا کہ اب بچے ان کے پاس نہیں آئیں گے۔ اسے خاموش دیکھ کر زیبا جانے کی ضد کرنے لگی۔ مجبور ہو کر اس نے چادر اٹھائی' بچی کو لے کر باہر نکلا' دروازے پر تالا ڈالا اور انگلی اسے تھما کر چل پڑا۔ چلتے چلتے وہ جگہ پر پہنچ گئے لیکن وہاں بیٹھنا فضول ہی تھا۔

انہوں نے مخصوص جگہ چادر بچھائی اور بیٹھ گئے۔ وہ دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھا تھا اور ننھی زیبا اس سے ٹکی بیٹھی تھی۔

کچھ دیر بعد زیبا نے کہا۔ "بابا آواز کیوں نہیں لگاتے؟"

"آواز لگانے کو ہے ہی کیا ہمارے پاس۔" اس بار وہ چڑ گیا۔ زیبا چند لمحے خاموش رہی پھر اس نے خود ہی آواز لگا دی۔ "واٹر بال لے لو......... رنگ برنگی واٹر بال........."

نجمی نے سختی سے بچی کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ بچی سہم کر روئی تو اس کا دل کٹنے لگا۔

"نہ رو میری گڑیا' دیکھو تو......... ہمارے پاس واٹر بال ہے ہی نہیں۔"

بچی روتی رہی' وہ اس کے رخسار سہلاتا' آنسو پونچھتا اور اسے چمکارتا رہا پھر دھوپ سر پر آ گئی۔ پہلی بار دھوپ اسے ڈس رہی تھی۔ اسے احساس ہوا کہ آدمی کے لئے روزگار سائبان کی طرح ہوتا ہے۔ آدمی محنت کر کے روزی کمائے تو دھوپ بری نہیں لگتی۔ شاید اس لئے کہ روزی کی صورت میں آدمی کو اس کا معاوضہ ملتا ہے اور روزگار نہ ہو تو دھوپ سہی نہیں جاتی۔ ایک دن پہلے تک یہی دھوپ اسے کچھ نہیں کہتی تھی۔ اسے احساس تک نہیں ہوتا تھا اور آج جیسے وجود میں سوئیاں سی اتری جا رہی تھیں۔ اسے یاد آیا کہ سامنے ایک پیڑ ہے۔ اس نے زیبا سے پوچھا۔ "سامنے کوئی پیڑ ہے؟"

"ہاں بابا۔"

"تو چل' وہاں چل کے چادر بچھا لے۔"

وہ پیڑ کے نیچے جا بیٹھے' زیبا بہت دیر سے بھوک ضبط کر رہی تھی۔ سمجھ گئی تھی کہ گیندیں نہیں ہیں تو پیسے بھی نہیں ملیں گے اور پیسے نہیں ہوں گے تو کھانا بھی نہیں ملے گا۔ بھوک برداشت سے باہر ہو گئی تو وہ چپکے چپکے رونے لگی۔ نجمی نے یہ بات محسوس کر لی۔

"کیا بات ہے بٹیا؟" اس نے پوچھا۔

"بھوک لگ رہی ہے بابا۔"

وہ اسے بہلانے کی کوشش کرنے لگا لیکن معصوم بچی روئے جا رہی تھی۔ انہوں نے گزشتہ دن کی طرح کھانا کھایا اور پیڑ کے نیچے آ بیٹھے۔

دوپہر بیت گئی' شام آ گئی' آہٹیں جاگ اٹھیں۔ نجمی زیبا کو لے کر گھر کی طرف چل دیا۔

اس رات نجمی کے پاس کچھ بھی نہیں تھا۔ زیبا بھوک سے بلکتی رہی اور وہ کچھ نہ کر سکا۔ زیبا کی گھٹی گھٹی گریہ و زاری اس کے دل پر ضربیں لگا رہی تھی۔ ہر آہ پر......... رونے کی ہر گھٹی ہوئی آواز پر ایسا لگتا تھا کہ وہ تھوڑا سا مر گیا ہے اور جب بہت دیر کے بعد پہلی بار زیبا نے کہا۔ "بابا بھوک لگی ہے' کھانا کھلا دو۔" تو وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دیا۔

اس نے اپنی ٹھوڑی زیبا کے ہونٹوں پر رکھ دی جیسے اسے اپنے آنسو پلانا چاہ رہا ہو۔

"میری بچی' اس وقت صبر کر لے' اب تو ہوٹل بند ہو چکے ہیں۔" اس نے گھٹی گھٹی آواز میں کہا۔ "صبح تجھے کھانا کھلاؤں گا۔"

لیکن کھانا کہاں سے آئے گا' یہ اسے بھی معلوم نہیں تھا۔ اگلی صبح اسے زیبا کا منہ دھلانے کی ضرورت نہیں پڑی۔ یہ کام بھوک کی وجہ سے بہنے والے آنسوؤں نے پہلے ہی کر دیا تھا۔

"بابا.........گیندیں بیچنے چلو نا۔" زیبا نے ہچکیاں لیتے ہوئے کہا۔

وہ پھر اسی دیوار کے ساتھ چادر بچھا کر بیٹھ گئے۔ تھوڑی دیر بعد زیبا پھر رونے لگی۔

اب تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد مسلسل کہہ رہی تھی۔ "بابا بھوک لگی ہے' بابا کھانا کھلا دو۔" یہ آواز اور بچی کی سسکیاں نجمی کو پتھر بنائے دے رہی تھیں۔ بچی کو روتے اور باپ سے کھانا مانگتے ہوئے چند راہ گیروں نے دیکھا تو چادر کی طرف سکے اچھال دیئے۔ لمحہ بہ لمحہ پتھر بنتے ہوئے نجمی نے چیخ کر کہنا چاہا' میں کچھ نہیں مانگتا' میں بھکاری نہیں ہوں۔ اٹھا لو یہ سکے لیکن یہ چیخ اس کے اندر ہی گونج کر رہ گئی۔ اس کی قوتِ گویائی جیسے سلب ہو کر رہ گئی تھی۔ وہ کچھ نہ کہہ سکا۔ سکے گرتے' کھنکھناتے' قہقہے لگاتے رہے جیسے اس کی بے بسی کا مذاق اڑا رہے ہوں۔ اس کے اندر جنگ جاری تھی۔ ضمیر شعور پر ضربیں لگا رہا تھا۔

بچی کی گریہ و زاری بلند آہنگ ہوتی جا رہی تھی۔ اسے محسوس ہو رہا تھا کہ اس کی روح پر کوڑے برس رہے ہیں۔

پھر بچی کی آواز بتدریج ڈوبنے لگی۔ وہ اس کے زانو پر سر رکھ کر لیٹ گئی۔ وہ اس کا سر سہلاتا رہا' بچی کا جسم مسلسل لرز رہا تھا' اس کی پیشانی سرد ہو رہی تھی۔

نجمی کا دل ڈوبنے لگا۔ اس کے اپنے پیٹ میں بھی اینٹھن ہو رہی تھی۔

ایسے میں اس کے ذہن میں جیسے منطق کا کوئی عالم جاگ اٹھا۔ میں نے کسی کے سامنے ہاتھ نہیں پھیلائے' کسی سے کچھ نہیں مانگا' یہ بھیک تو نہیں.........

لیکن یہاں بیٹھے تو ہو۔ ضمیر نے ملامت کی۔ ہاتھ نہیں پھیلاتے تو یہاں راستے میں چادر بچھائے کیوں بیٹھے ہو' گھر جا کر بیٹھو پھر دیکھو' کتنے سکے گرتے ہیں آنگن میں۔

میری بچی بھوکی ہے' مرجائے گی۔ شعور کی آواز ابھری اور اتنی شدت سے ابھری کہ ضمیر دب گیا۔ اس نے ٹٹول کر گنا۔ وہ پونے گیارہ روپے تھے۔ اس نے پیسے سمیٹ کر جیب میں رکھے' بچی کی انگلی پکڑی اور آہستہ آہستہ آہٹوں پر کان دھرے احتیاط سے قدم اٹھاتا ہوا ہوٹل کی طرف چل دیا۔

اس دن کے بعد زیبا بھوک سے کبھی نہیں روئی۔ اس عید پر وہ اسے نئے کپڑے نہیں دلا سکا تھا لیکن اسے پانچ روپے عیدی بہرحال دی اور کہا۔ "جا بٹیا آئس کریم کھا.........چیزیں کھا' جا کر کھیل.........." اور وہ خود پچھلی عیدوں کی' قمرن کی یادوں سے کھیلتا رہا۔

صغریٰ ہسپتال سے رخصت ہو کر آئی تو اسے دیکھ کر دھک سے رہ گئی۔ "ارے نجمی یہ کیا ہوا تجھے؟"

نجم الحسن اتنے دنوں میں ہی ڈھل گیا تھا۔ وہ وقت سے کہیں پہلے بوڑھا لگنے لگا تھا۔

صغریٰ کی بات سن کر وہ رو پڑا۔ آنسو تھمے تو اس نے صغریٰ کے سامنے اپنا دل کھول کر رکھ دیا۔

"نہ رو میرے بیٹے' نہ رو۔" صغریٰ نے اسے تسلی دی پھر دکھ بھرے لہجے میں بولی۔ "تیرے کچھ پیسے بچے ہوئے تھے میرے پاس۔ انہیں بیماری کھا گئی۔ پھر بھی وہ امانت ہے میرے پاس۔ اب میں کل سے کام پر جاؤں گی۔ کچھ پیشگی لے لوں گی' کام چل جائے گا۔ تنخواہ ملے گی تو تیرا قرض لوٹا دوں گی' تو پھر سے کام شروع کر دینا۔"

"نہیں خالہ' اب مجھ سے کوئی کام نہیں ہو گا۔"

"کیوں بیٹا؟ ایسے حوصلہ نہیں ہارتے!"

"خالہ' آنکھوں کے بغیر تو میں ہر قدم پر لٹتا رہوں گا۔ فریبی تو ہزار بہروپ بدل کر سامنے آتے رہیں گے۔ میں کس کس کو پہچانوں گا۔ نہیں خالہ تم نہیں سمجھ سکتیں۔ مجھ میں اب کبھی اعتماد پیدا نہیں ہو گا۔ میں اب کچھ نہیں کر سکتا خالہ۔"

جہاں دیدہ صغریٰ اس کا کرب اور بے اعتمادی سمجھ گئی۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ نجمی اس سے بھی کٹ جائے۔ اس کے لئے ضروری تھا کہ وہ اس سے اختلاف نہ کرے۔ اب

تو وہ اور نازک.......... اور زود حس ہو گیا تھا۔ "بس اب تُو کھانے کی طرف سے بے فکر ہو جا۔" اس نے کہا۔

صغریٰ اسے بھیک لینے سے منع نہ کر سکی۔ زندگی اسی طرح رواں دواں رہی۔ نجمی ہر صبح صغریٰ کا لایا ہوا ناشتا کرنے کے بعد اور دوپہر کا کھانا ساتھ لے کر زیبا کے ہمراہ گھر سے نکلتا۔ دیوار کے سائے میں چادر بچھاتا اور بیٹھ جاتا۔ وہ خاموش بیٹھا رہتا۔ اس کے منہ سے کبھی کوئی صدا نہ نکلتی۔ سورج کی کرنوں کے نیزے چبھنے لگتے تو وہ چادر اٹھا کر درخت کے نیچے جا بیٹھتا۔ شام کو پان والے کو ریزگاری دے کر وہ نوٹ لیتا اور گھر کا رخ کرتا۔ صغریٰ کو خرچ کے لئے پیسے دینے وہ کبھی نہیں بھولا۔

☆======☆======☆

آج.......... اتنے برسوں کے بعد وہ پھر بدترین عدم تحفظ کے احساس کا شکار ہو گیا تھا۔ وہ بیٹھا سوچتا رہا۔ اتنے برسوں میں اس نے کیا بھی کیا تھا! بس سوچتا اور جو نتیجہ نکالتا زیبا یا خالہ صغریٰ کے کانوں میں انڈیل دیتا' اسے اس سے غرض نہ ہوتی کہ ان کی سمجھ میں بھی کچھ آیا ہے یا نہیں۔ اس کے نطق کو تو بس کسی سماعت کی ضرورت تھی اور وہ صغریٰ کی تھی یا زیبا کی۔

ایسے ہی ایک موقع پر اس نے صغریٰ خالہ کو بتایا تھا کہ وہ نوٹوں اور سکوں کے بارے میں کس انداز سے محسوس کرتا ہے۔ دونوں میں کیا فرق کرتا ہے۔ "یہ سکے جو ہوتے ہیں نا خالہ' بڑے کم ظرف ہوتے ہیں۔ سرگوشی بھی کرتے ہیں تو دور تک گونجتی ہے۔ کسی کی جیب میں ہوں تو آپس میں لڑتے' ہنستے' کھیلتے' اتنا شور مچاتے ہیں کہ ساری دنیا اسے دیکھنے لگے حالانکہ ہوتا کچھ زیادہ نہیں ہے اس بچارے کے پاس' زیادہ ہوتا ہے تو اس کے پیچھے لٹیرے' جیب کترے لگ جاتے ہیں۔ کسی کی مدد کرتے ہیں تو ساری دنیا کو پتہ چل جاتا ہے' اس کے برعکس نوٹ بڑے ظرف والے ہوتے ہیں۔ ان کا لہجہ شیریں ہے اور آواز اتنی دھیمی کہ کان لگائے رکھنے والوں تک بھی نہ پہنچے.........."

اور اب وہ بیٹھا سوچ رہا تھا کہ اس نے تصویر کا صرف ایک رخ دیکھا تھا۔ خاموشی صرف ظرف کی نہیں ہوتی' بدنیتی کی بھی ہوتی ہے۔ بڑی خاموشی سے کسی کی طرف کچھ بڑھانے والا ہاتھ بعض اوقات ضرورت مند کے پردے کا نہیں' اپنے گندے عزائم کے پردے کا کام کرتا ہے۔ وہ کاروباری ہاتھ ہوتا ہے اور ایسے کسی کاروبار سے متعلق ہوتا ہے' جو کھلے بندوں نہیں کیا جا سکتا اور عزت ہی سب سے سستی جنس ہے اور عزت ہی

سب سے مہنگی جنس ہے۔

لیکن راستے میں بیٹھے بھکاری کی تو کوئی عزت نہیں ہوتی' اس نے تلخی سے سوچا۔ کم از کم راستے سے گزرنے والوں کے نزدیک تو ہو بھی نہیں سکتی۔ چاہے اپنے تئیں وہ کچھ بھی سمجھتا رہے۔

آج اچانک اسے شاک لگا۔ اس کی بیٹی' اس کی ننھی زیبا جوانی کی سرحد میں قدم رکھ چکی تھی۔ اس کا اسے خیال بھی نہیں آیا تھا۔ اس کے نزدیک تو وہ تین سال کی بچی تھی۔ وہ اسے تصور میں دیکھتا تو وہ اسی روپ میں نظر آتی جس میں وہ اپنی بینائی کے آخری دن اسے صغریٰ کے پاس چھوڑ کر گیا تھا۔ اس کے پاس دیکھنے کے لئے وہی آخری حوالہ تھا اس کا۔ اس نے بیٹی کو بڑھتے دیکھا جو نہیں تھا۔ وہ تصور میں کیسے اسے جوان دیکھتا! اب وہ سوچ رہا تھا کہ دنیا کتنی بدل گئی ہوگی۔ چوک میں کتنی تبدیلیاں آگئی ہوں گی۔ کتنے نئے مکان بنے ہوں گے۔ کتنی نئی دکانیں کھلی ہوں گی۔ کون جانے سامنے والا مکان دو منزلہ ہو گیا ہو' اس کے تصور میں وہی منظر آ سکتا تھا' جو اس نے بینائی گنوانے سے پہلے آخری بار دیکھا تھا۔ اندھے آدمی کے لئے صرف آخری دید کا حوالہ ہوتا ہے۔ وہ تو اسی ایک حوالے سے گرد و پیش کا تصور کرتا ہے۔ اچانک بینائی جانا ایسا ہے جیسے کوئی فلم چلتے چلتے ٹوٹ جائے۔ نہیں' ٹوٹ جائے نہیں ایک جگہ روک دی جائے' ساکت ہو جائے' اسٹل کر دی جائے۔

اس نے سوچا مجھ اندھے کو تو معلوم ہی نہیں کہ پُل کے نیچے سے کتنا پانی بہہ چکا ہے۔

پھر اسے خیال آیا کہ یہ تو میری اپنی غلطی ہے۔ میری بینائی ہی تو گئی تھی' یاد داشت تو نہیں گئی تھی۔ میرے پاس اور حِسیں بھی تو تھیں' جن سے بہتے وقت کے دھارے کی پیائش کر سکتا تھا۔ تغیر کو سمجھنے کے لئے حوالے تھے میرے پاس۔ قمرن نے میرے ساتھ مل کر جو کیاری بنائی تھی' جو پودے لگائے تھے' میں جانتا تھا کہ وہ پھل پھول رہے ہیں۔ چنبیلی کی بیل دیوار پر بندھی ستلی کے سہارے چڑھتے چڑھتے خالہ صغریٰ کے گھر میں اتر گئی ہے۔ گلاب بھر کر کھلتے ہیں اور ان کے محافظ کانٹے تیز اور چوکس ہو جاتے ہیں۔ گرمی کے

موسم میں موتیا کیسے خوشبو کے مدھر گیت گنگنائے چلا جاتا ہے اور رات کی رانی کا جادو کیسے سر چڑھ کر بولتا ہے۔ یہ سب تو میں سمجھتا اور محسوس کرتا رہا' ہاتھوں سے چھو کر قمرن کی ان یادگاروں کو شباب کی طرف بڑھتے دیکھتا رہا۔ کیا ان کی مدد سے مجھے وقت کے گزرنے کا اندازہ نہیں ہونا چاہئے تھا۔ نہیں.......... غلطی میری ہی ہے۔ میں قمرن کی آخری نشانی کی طرف سے اتنا بے خبر کیسے رہا۔ مجھے کیوں نہیں پتا چلا..........

لیکن جیسے وہ ہر شام چنبیلی کو.......... پودوں کو بڑی نرمی سے سہلاتا تھا' ان کے پھلنے پھولنے پر خوش ہوتا تھا' ویسے ہی وہ زیبا کو بھی چھوتا تھا۔ بلکہ زیبا کو تو وہ سینے سے لگا کر.......... لپٹا کر سوتا تھا' پھر میں کیوں بے خبر رہا؟

لیکن آدمی اور پودوں میں بڑا فرق ہوتا ہے۔ پودے جلدی بڑھتے ہیں اور آدمی کے بچے بڑی مشکل سے پلتے ہیں.......... بہت آہستہ آہستہ.......... غیر محسوس طور پر بڑے ہوتے ہیں۔ پھر بھی..........

پھر اسے ایک بات یاد آنے لگی۔ اسے تسلیم کرنا پڑا کہ بے خبری اس کی جہالت تھی۔ وہ آنکھوں کا ہی نہیں بلکہ عقل کا بھی اندھا ثابت ہوا تھا۔ فطرت نے اسے بار بار اشاروں کنایوں سے سمجھانے کی کوشش کی تھی۔ اب فطرت تو بولنے سے رہی! وہ تو خوشبو کی' دھوپ کی.......... مختلف مظاہر کی زبان میں بولتی ہے۔ وہ نہیں سمجھا تو یہ اس کی اپنی حماقت تھی۔

اسے سب کچھ یاد آنے لگا۔

خاصا عرصہ پہلے.......... اب اس کے پاس وقت کا پیمانہ تو کوئی تھا نہیں' بس دن پر دن گزرتے چلے گئے تھے اور کم ہی دن ایسے تھے جن میں کوئی خصوصیت تھی۔ یہاں تو عید بقرعید ایک جیسی گزری تھیں۔ بہرحال کچھ عرصہ پہلے ہر رات اس سے لپٹ کر سونے والی زیبا کچھ بدل سی گئی تھی۔ وہ سمٹ کر سونے لگی۔ وہ اسے خود سے قریب کرتا بھی تو وہ تھوڑی دیر بعد غیر محسوس طور پر خود کو علیحدہ کر لیتی۔ اس سے دور ہو جاتی۔

پھر اچانک اس نے ایک رات کہا۔ "بابا میں الگ سوؤں گی۔"

"وہ کیوں بٹیا؟"

"میں بڑی ہو گئی ہوں بابا۔"

نجی کو اس کے لہجے کی معصومیت آج بھی یاد تھی لیکن اس نے اس کی بات کو کوئی اہمیت نہ دی تھی۔ بچوں کو بڑے ہونے کا بڑا ارمان ہوتا ہے۔ یہ کہنا ہر بچے کا خواب ہوتا ہے کہ میں بڑا ہو گیا ہوں۔ زیبا دوسری چارپائی پر سونے لگی مگر نجی کو کبھی گمان بھی نہ ہوا کہ وہ بڑی ہو گئی ہے۔ اس کے تصور میں تو بیٹی تین سال کی اس عمر پر ٹھہر گئی تھی، جس میں اس نے اسے آخری بار اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔

اسے ایک اور بات یاد آئی۔ ایک صبح خالہ صغریٰ ناشتا لے کر آئی تو زیبا سو رہی تھی۔ وہ اس وقت غسل خانے میں منہ دھو رہا تھا۔ صغریٰ نے زیبا کو جگایا۔ زیبا نے اسے سلام کیا تو وہ جواب دینے کے بعد بولی۔ "زیبا......... میری گڑیا، دیکھ لڑکیاں ایسے نہیں سوتیں۔"

"اچھا نانی!" زیبا نے جواب دیا تھا۔

اسے اور بھی بہت کچھ یاد آتا رہا۔

اسے ایک بار یوں ہی سا احساس ہوا تھا کہ صغریٰ زیبا پر زیادہ توجہ دینے لگی ہے لیکن اس نے اسے کوئی اہمیت نہیں دی تھی۔

رات کا کھانا کھانے کے بعد اور صبح کبھی کبھی وہ زیبا کو الگ لے جاتی۔ شاید کچھ سمجھاتی ہو گی ایسے میں۔ اب سوچنے اور غور کرنے کے بعد وہ یہ تسلیم کرنے پر مجبور ہو گیا کہ زیبا اب بچی نہیں رہی۔ جوان ہو رہی ہے۔ یہ یقین دلانے کے لئے تو آج کا واقعہ ہی کافی تھا۔ اسے آنکھوں سے محرومی کا اتنی شدت سے احساس ہوا کہ لٹنے والے واقعے کے بعد سے اب تک نہیں ہوا تھا۔ اسے اپنے کندھے شل اور جھکے ہوئے محسوس ہونے لگے۔ یہ آنکھوں سے محرومی ہی تھی کہ وہ تصور بھی نہیں کر سکتا تھا کہ اس کی زیبا بڑی ہو کر کیسی لگی ہے پھر اب اس کی حفاظت کا بوجھ پہلی بار اسے محسوس ہوا تھا۔ بیٹی کا بوجھ تو بادشاہوں کے سر اور کندھے جھکا دیتا ہے، وہ تو پھر ایک بے بضاعت اندھا بھکاری تھا۔

اس نے سوچا اور لرز کر رہ گیا۔ "اے اللہ، میں ہار گیا۔ مجھ پر رحم فرما۔" اس کے دل سے دعا نکلی۔ "میری زیبا کی حفاظت فرما۔ اس کے نصیب اچھے کر دے۔"

لیکن اسے اپنی اس دعا پر خود بھی یقین نہیں تھا۔ ایک تو پچھلے مصائب، پچھلے موقعوں پر اس کی دعائیں کون سی قبول کی گئیں حالانکہ وہ انہونی نہیں تھی۔ اگر اس وقت خدا نے اس کی سن لی ہوتی تو آج یہ حال کیوں ہوتا۔ خیر اس کڑے وقت نے اسے خدا سے پچھلی تمام تلخیوں کے باوجود قریب کر دیا تھا لیکن اب وہ اپنی پچھلی نامقبول دعاؤں کی وجہ سے بے اعتمادی محسوس کر رہا تھا۔ اللہ نے جب نہیں سنی تو اب یہ دشوار دعا کیا سنے گا۔

ایک ایسی لڑکی کے نصیب کیسے اچھے ہو سکتے ہیں جو ایک بھکاری کی بیٹی ہو۔ بارہ سال باپ کے ساتھ سڑک پر چادر بچھا کر بیٹھتی رہی ہو۔ جس میں کوئی خوبی، کوئی وصف نہ ہو۔ نہ تعلیم، نہ تربیت، نہ گھرداری کا شعور۔ وصف تو رشتہ مانگنے والے دولت مندوں کی بیٹیوں میں بھی ڈھونڈتے ہیں۔ یہاں تو کچھ بھی نہیں ہے۔ ایسے میں اچھے نصیب.........!

"بابا!" زیبا کی آواز نے اسے چونکا دیا۔

"کیا.........کیا بات ہے بٹیا؟"

"گھر نہیں چلنا ہے کیا؟"

نجی نے کوئی فوری جواب نہیں دیا۔ کیسے دیتا! اسے ایک اور جھٹکا لگا تھا۔ اس سے سنبھلنے میں وقت تو لگتا! وہ تو آواز میں کھو گیا تھا۔ کیا یہ زیبا کی آواز ہے؟ وہ حیرت سے سوچ رہا تھا اور کب سے ہے؟ یہ آواز کی کھنک اور موسیقیت......... یہ لہجے میں اتراہٹ۔ یہ تو آتی ہی جوانی کے ساتھ ہے۔ اندھوں کی سماعت بینائی بن جاتی ہے۔ میں کیسا اندھا تھا کہ بیٹی کی آواز اور لہجے کی تبدیلی بھی محسوس نہ کر سکا۔ یہ تو سورج والی بات ہے۔ سورج چڑھتا ہے تو اندھوں کو بھی پتہ چل جاتا ہے.........

"چلو نا بابا!"

"ہاں چلو بٹیا چلتے ہیں۔" گھر پہنچ کر بھی وہ گم صم رہا، بیٹھا سوچتا رہا۔ اب تک اس نے بے حسی کی زندگی گزاری تھی۔ بے حسی بھی ایک حصار کی طرح ہوتی ہے لیکن آج وہ حصار ٹوٹ گیا تھا۔ اس رات صغریٰ کھانا لائی تو اس نے اس سے پوچھا۔ "خالہ، قمرن کی موت کو کتنے سال ہو گئے ہوں گے؟"

صغریٰ چند لمحے حساب لگاتی رہی پھر بولی۔ "بارہ سال سے کچھ اوپر ہو گئے ہیں۔"

وہ خاموش ہو گیا۔ صغریٰ کی سمجھ میں کچھ نہ آیا۔ کھانے کے دوران وہ سوچتا رہا' جس راستے پر خطرہ ہو اس پر تو عقل مند آنکھوں والے بھی پاؤں نہیں دھرتے۔ وہ تو پھر اندھا تھا۔ بہت سوچنے کے بعد وہ اس نتیجے پر پہنچا کہ اب زیبا کو ساتھ لے کر جانا ٹھیک نہیں ہے۔ اب وہ اکیلا ہی جایا کرے گا۔ صغریٰ برتن لے جانے لگی تو اس نے آہستہ سے کہا۔ "خالہ۔ ایک گھنٹے کے بعد آ سکتی ہو؟"

"کیا بات ہے نجمی؟ آج تو پریشان ہے بہت؟"

"ہاں خالہ' اسی سلسلے میں بات کرنی ہے تم سے' لیکن زیبا کے سامنے نہیں۔ زیبا سو جائے تو آ جانا۔"

"ٹھیک ہے میں آ جاؤں گی۔"

کوئی آدھے گھنٹے بعد تمام آہٹیں سو گئیں تو اس نے زیبا کو پکارا۔ کوئی جواب نہ ملا۔ اس نے دوسرے پلنگ کی طرف جا کر ٹٹولا۔ وہ بے سدھ سو رہی تھی۔ وہ کیاری کی طرف بڑھ گیا۔ اس نے چنبیلی کی بیل کو سہلاتے ہوئے ایک گہری سانس لے کر خوشبو سینے میں اتاری اور بڑبڑایا۔ "قمرن.......... میں بھول گیا تھا کہ تم نے اس کیاری میں چار نہیں پانچ پودے لگائے تھے۔ مجھے پتہ ہی نہیں چلا کہ پانچویں پودے میں مہکتے پھول کھلنے لگے ہیں۔ اب بتاؤ' میں اس کی کیسے حفاظت کیسے کروں! میں تو خود بغیر سہارے کے نہیں چل سکتا۔"

کچھ دیر بعد صغریٰ آ گئی۔ اس نے زیبا کو سوتے دیکھ کر اطمینان کی سانس لی۔ پھر کہا۔ "اب بتا' کیا بات ہے بیٹا؟"

نجمی نے اپنے دل کا بوجھ اتار دیا۔ "خالہ مجھے پتہ ہی نہیں چلا کہ بیٹی جوان ہو گئی ہے۔" اس نے آخر میں کہا۔ "یہ بوجھ میں کیسے اٹھا سکوں گا۔"

"جو بوجھ دیتا ہے وہ بوجھ اٹھانے کی طاقت بھی دیتا ہے۔" صغریٰ بولی۔

"لیکن میرے ساتھ تو اس نے بڑا ظلم کیا ہے۔" نجمی کے لہجے میں سرکشی تھی۔

"ایسے نہیں کہتے بیٹے۔" صغریٰ نے نرم لہجے میں کہا۔ "مجھے دیکھ' میں نے شوہر ہی نہیں' چار جوان بیٹے اور دو جوان بیٹیاں گنوائی ہیں لیکن میرا ایمان ہے کہ سب کچھ اللہ کی

طرف سے ہے اور اسی میں انسان کے لئے بہتری ہوتی ہے' جسے وہ سمجھ نہیں پاتا اور میں یہ بھی جانتی ہوں کہ اس شہر میں مجھ سے زیادہ دکھی لوگ بھی ہیں.........."

نجمی نے دل میں تسلیم کیا کہ صغریٰ بہرحال اس سے زیادہ مظلوم ہے۔ اتنا کچھ وہ گنواتا تو شاید پاگل ہی ہو جاتا۔ تاہم اس نے بہت بے زاری سے کہا۔ "میری سمجھ میں نہیں آتا کہ قمرن کی اور میرے بیٹے کی موت میں میرے لئے کیا بہتری تھی۔ ہم نے تو سختی ہی دیکھی ہے۔"

"یہ زندگی تو چند روز کی ہوتی ہے نجمی' اگر یہاں راحت ہے اور اس زندگی میں جو کبھی ختم نہیں ہوگی' سختی آئی تو وہ زیادہ برا ہے۔ جو یہاں صبر شکر سے سختی جھیل لیتے ہیں' ان کے لئے وہاں کبھی نہ ختم ہونے والا آرام ہے۔ اس سے زیادہ بہتری اور کیا ہوگی۔"

نجمی تقریباً قائل ہو گیا۔ "خیر خالہ ان باتوں کو چھوڑو۔ اس وقت تو میرے سامنے ایک سنگین مسئلہ ہے۔ کل سے میں زیبا کو ساتھ نہیں لے جاؤں گا۔"

"یہ تو میں بہت پہلے تم سے کہنا چاہتی تھی مگر ڈر تھا کہ کہیں تو برا نہ مان جائے۔ پھر بھی میں بچی کو اونچ نیچ بتاتی رہتی تھی۔"

"پر خالہ' میں زیبا کو گھر اکیلا کیسے چھوڑوں گا؟" نجمی نے پُرتشویش لہجے میں کہا۔

"اکیلی کیوں' وہ میرے پاس رہے گی۔ میں اسے خانہ داری بھی سکھاؤں گی۔ تعلیم تو نہیں دے سکتی لیکن گھرداری تو سکھا سکتی ہوں اسے۔"

"مگر خالہ' تم کام پر جو جاتی ہو!"

"تو کیا ہوا' اسے بھی ساتھ لے جاؤں گی۔"

"لیکن خالہ.........." نجمی ہچکچایا۔

"لیکن ویکن کچھ نہیں۔" زندگی میں پہلی بار صغریٰ نے اسے ڈپٹ کر کہا۔ "تو سمجھتا ہی نہیں۔ دنیا سے کٹ کر جینے والا کچھ بھی نہیں سیکھتا۔ جاہل ہی رہتا ہے۔ لوگوں میں اٹھے بیٹھے گی تو بات کرنے کی تمیز آئے گی۔ میں اس سے کام تھوڑا ہی کراؤں گی!"

نجمی اپنی جہالت کا تو پہلے ہی قائل ہو چکا تھا۔ اس نے یہ بات بھی مان لی۔ اس کے دل کا بوجھ کسی حد تک کم ہو گیا۔ پوری طرح تو وہ زیبا کی شادی کے بعد ہی ہلکا ہو سکتا تھا

اور وہ جانتا تھا کہ یہ کوئی آسان کام نہیں۔

"میری ایک اور بات مان لے نجمی۔" صغریٰ نے کہا۔

"بولو خالہ۔"

"اب تو کوئی کام شروع کردے۔"

"صاف کہو نا بھیک مانگنا چھوڑ دے۔" نجمی نے بے حد تلخی سے کہا۔

"میں نے کوئی بری بات نہیں کی۔" صغریٰ نے ملائمت سے کہا۔ "میں صرف یہ کہہ رہی ہوں کہ اب بیٹی کا باپ بن کر سوچا کر۔ دیکھ کوئی رشتہ آئے گا تو........"

اس کے بعد صغریٰ کہتی رہی لیکن نجمی نے کچھ نہیں سنا۔ اس لمحے اسے احساس ہوا کہ وہ بھی قمرن کی ذہنی سطح کو پہنچ چکا ہے۔ جیسے قمرن کہتی تھی کہ گھر کے نام پر مجھے ایک جھونپڑی ہی مل جائے تو خدا کا شکر ادا کروں گی' ویسے ہی زیبا کا رشتہ اس کے لئے اہمیت اختیار کر گیا ہے۔ اس کی سوچ بھی قمرن کی سی ہو گئی تھی' جیسا بھی ہو' بس زیبا کا رشتہ آ جائے تو میں تمام عمر خدا کا شکر ادا کرتا رہوں گا۔

"تُو نے جواب نہیں دیا میری بات کا۔" صغریٰ نے اسے چونکا دیا۔

"خالہ' اب مجھ میں لٹنے کی ہمت نہیں۔"

"ضروری تو نہیں ہے کہ تُو ہر بار لٹے........"

"لیکن خالہ........"

"دیکھ' بیٹی کے باپ کے لئے محنت مزدوری میں کوئی برائی نہیں۔ کسی کے لئے بھی نہیں........ خیر تُو مجھ سے زیادہ سمجھتا ہے۔"

"پر خالہ میں کیا کروں؟"

"کچھ بھی۔ جو تجھے مناسب لگے۔"

وہ سوچ میں پڑ گیا۔ پھر بولا۔ "کسی کام کے لئے پیسہ کہاں سے آئے گا؟"

"تیرے دیئے ہوئے پیسوں میں سے میں بچت کرتی ہوں۔ پانچ ساڑھے پانچ سو ہیں میرے پاس۔"

نجمی کی آنکھیں ممنونیت سے بھیگ گئیں۔ اس نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

"شکریہ خالہ۔ تم نے میری مدد بھی کی اور مجھے سیدھا راستہ بھی دکھایا۔ میں سوچوں گا کہ کیا کام شروع کروں۔"

صبح کے ناشتے کے بعد زیبا نے کہا۔ "چلو بابا۔"

"نہیں بٹیا۔ آج کہیں نہیں جاؤں گا۔" اس نے کہا۔ "اور آج سے تُو نانی کے ساتھ جایا کرے گی۔ نانی کے ہی ساتھ رہا کرے گی۔"

"کیوں بابا؟" زیبا گھبرا گئی۔ "تم کہاں جا رہے ہو؟"

"میں کہیں نہیں جا رہا ہوں پگلی۔" وہ مسکرایا۔ "اب تجھے گھر کے کام سیکھنے چاہئیں۔ نانی تجھے سکھا دے گی سب۔"

"اچھا بابا۔"

صغریٰ زیبا کو ساتھ لے کر چلی گئی۔ ایک مسئلہ تو حل ہو گیا۔ کام کے لئے اس نے سوچا کہ وہی پرانا کام مناسب رہے گا' واٹر بال بیچنا۔ بس یہ ہے کہ وہ اب کسی پر اعتبار نہیں کرے گا۔ دوسرا مسئلہ اس کے اختیار میں نہیں۔ اس نے حقیقت پسند بن کر سوچا' لڑکیوں کے رشتہ کا مسئلہ تو ہمیشہ سے ہی بہت کٹھن رہا ہے پھر اس کی زیبا میں تو کوئی خاص بات ہی نہیں تھی۔ وہ صرف تعلیم سے ہی نہیں تربیت سے بھی محروم تھی۔ صورت شکل کے بارے میں وہ محض اندازہ لگا سکتا تھا کہ وہ قبول صورت ہو گی۔ جہاں اتنی کچھ کمی ہو' وہاں جہیز دے کر ہی اسے پورا کیا جاتا ہے لیکن وہ خود کو بیچ دے تب بھی معمولی سے جہیز تک کا متحمل نہیں ہو سکے گا۔ ایسے میں کون اس کی زیبا کو پوچھے گا۔ یہ خیال رہ رہ کر نجمی کے دماغ میں ڈنک چبھونے لگا۔

اس نے بارہ برس تک خدا سے لڑائی رکھی تھی۔ اپنی ہر تباہی پر اس سے نالاں رہا تھا۔ اس سے منہ موڑ رکھا تھا لیکن آج بیٹی کی فکر نے اسے ہتھیار ڈالنے پر مجبور کر دیا۔ اس نے اپنی بے نور آنکھیں آسمان کی طرف اٹھائیں اور گڑگڑایا۔ "جیسا بھی ہو' میں تجھ سے اپنی بیٹی کے لئے ایک رشتے کا سوال کرتا ہوں۔ وعدہ کرتا ہوں کہ اس میں نخرے نہیں کروں گا۔ پہلے ہی رشتے کو تیری نعمت سمجھ کر قبول کر لوں گا۔ بس اب تُو جان۔ یہ عہد بھی کرتا ہوں کہ جب یہ بوجھ ہلکا ہو گیا تو زندگی کی ہر سانس میں تیرا شکر ادا کروں گا۔

آخری لمحوں تک تیرا شکر گزار اور مطیع رہوں گا۔ کبھی ناشکری' نافرمانی نہیں کروں گا۔"
پھر وہ مطمئن ہو کر بیٹھ گیا۔

☆======☆======☆

ایک برس بیت گیا۔ زندگی کے دھارے نے اپنا ایک راستہ بنا لیا تھا۔ صبح صغریٰ اور زیبا اس کے ساتھ نکلتیں۔ گیندوں کی بالٹی' پمپ' خالی گیندوں کا تھیلا اور چادر ان کے ساتھ ہوتی۔ وہ اسے اس کی بے در و دیوار اور بے چھت دکان پر چھوڑتیں اور خود کام پر نکل جاتیں۔ وہ بچوں کو لبھانے کے لئے طرح طرح کے نعرے وضع کرتا۔ گیندیں بیچتا۔ دوپہر کے سناٹے میں کھانا کھاتا۔ بالٹی کا جائزہ لیتا اور تازہ گیندیں بھرتا پھر شام کو صغریٰ اور زیبا اسے لینے آ جاتیں۔

اس عرصے میں اس کی طمانیت اور بڑھ گئی تھی اور اس کا سبب زیبا تھی۔ صغریٰ کی بات درست ثابت ہوئی تھی۔ زیبا اس کے ساتھ جاتی تھی لیکن ملازمہ کی حیثیت سے نہیں' صغریٰ اس سے بہت لاڈ کرتی تھی۔ کچھ وہ گھرانے بھی بہت اچھے تھے' جہاں وہ کام کرتی تھی۔ صغریٰ ان سے کہتی تھی' یہ پڑھے لکھے باپ کی بیٹی ہے' جو وقت کے پھیر میں آ گیا ہے۔ وقت خراب نہ ہوتا تو یہ شہزادیوں کی طرح رہ رہی ہوتی......... زیبا کو ہم جولیاں بھی میسر آ گئی تھیں۔ بڑی عمر کی عورتوں سے اسے شفقت ملتی۔ وہ انسانوں سے تعلقات کی اہمیت سے واقف ہو گئی' جس کا اسے پہلے علم ہی نہیں تھا۔ اسے دوستی کرنا آیا تو بات کرنا بھی آ گیا اور بات کرنا آیا تو خود اعتمادی بھی پیدا ہوئی۔ پہلے وہ حتی الامکان بولتی ہی نہیں تھی۔ بولتی تو جھجکتی' گھبراتی' سہم کر بولتی اور بول کر سہم جاتی۔

نجمی کو افسوس تھا کہ وہ اسے دیکھ نہیں سکتا۔ وہ بڑھ رہی تھی' یہی تو وقت تھا اسے دیکھنے کا پھر بھی اس کی آواز سے' لہجے سے وہ اس کا ارتقائی عمل محسوس کر سکتا تھا۔ وہ اسے چہکتے سنتا تو اس کے دل میں کلیاں سی چٹکنے لگتیں۔ جس دن خود زیبا نے اسے کھانا پکا کر کھلایا' اس دن تو اس کے دل میں بہار آ گئی۔ اس نے خوب لپٹا کر زیبا کو پیار کیا اور صغریٰ خالہ سے بولا۔ "خالہ........... تم نے جو کچھ میرے لئے کیا ہے' میں کچھ بھی کر لوں' تمہیں اس کا صلہ نہیں دے سکتا۔"

"تو مسکرا دے نجمی بیٹا۔ یہی میرا صلہ ہے۔"

نجمی مسکرا دیا۔ دوسری طرف تقدیر بھی مسکرا رہی تھی۔

کچھ لوگ ایسے ہوتے ہیں' جن کی زندگی حادثوں سے عبارت ہوتی ہے۔ نجمی بھی ان ہی میں سے تھا۔ اس روز گیندیں تقریباً ختم ہو چکی تھیں۔ صغریٰ زیبا کے ساتھ اسے گھر لے جانے کے لئے آئی تو اس نے کہا۔ "خالہ' پہلے مجھے گیندیں اور ربڑ دلوا دو پھر گھر چلیں گے۔" چنانچہ وہ تینوں بازار کی طرف چل دیئے۔

ایک جگہ انہیں سڑک پار کرنا تھا۔ صغریٰ نے نجمی کا ہاتھ تھام لیا۔ شام کا وقت تھا۔ ایسے میں بڑا رش ہوتا ہے' بسوں کی ریس رہتی ہے۔ صغریٰ کی پوری توجہ نجمی پر تھی۔ زیبا پیچھے پیچھے آ رہی تھی۔ وہ رکی ہوئی ایک بس سے آگے نکلے ہی تھے کہ سامنے سے ایک اور بس پوری رفتار سے آتی نظر آئی۔ صغریٰ نے جلدی سے نجمی کا ہاتھ پکڑ کر کھینچا۔ "جلدی کر بیٹا۔" بس کی تیز رفتاری کے باوجود وہ دونوں تیزی سے آگے نکل گئے مگر اگلے ہی لمحے بس کے بریک خوف ناک آواز میں چیخے' فضا میں ایک چیخ گونجی۔ لوگ دوڑ پڑے' ہنگامہ کھڑا ہو گیا۔ وہ چیخ زیبا کی تھی' جو نکلتے نکلتے بس کی لپیٹ میں آ گئی تھی۔

"ہائے میری بچی۔" صغریٰ چلاتی ہوئی سڑک پر گری زیبا کی طرف لپکی' وہ نجمی کو بھول ہی گئی۔ وہ وہیں فٹ پاتھ پر کھڑا پاگلوں کی طرح پوچھے جا رہا تھا۔ "کیا ہوا؟ ارے کیا ہوا؟"

کچھ لوگوں نے ڈرائیور کو کھینچ کر بس سے اتارا اور اس کی مرمت شروع کر دی۔ کچھ لوگ زخمی زیبا اور صغریٰ پر جھک گئے۔ صغریٰ تڑپ کر چیخے جا رہی تھی۔ "ہائے میری بچی.......... ہائے میری.........."

"اسپتال لے چلو اسے۔" کسی نے کہا۔

"کیا ہوا؟ کیا ہوا؟" نجمی پوچھے جا رہا تھا۔

"اندھے ہو کیا؟" برابر کھڑے راہ گیر نے کہا۔ "دیکھتے نہیں' ایکسیڈنٹ ہو گیا ہے۔"

"ہاں میں اندھا ہوں۔ بتاؤ کیا ہوا ہے؟" نجمی نے برا مانے بغیر کہا۔

راہ گیر نے مڑ کر دیکھا۔ "معاف کرنا بابا۔" اس کے لہجے میں معذرت تھی۔ "ایک لڑکی بس کی لپیٹ میں آ گئی ہے۔"

ایک ٹیکسی روک لی گئی تھی۔ زیبا کو اس میں لٹایا جا رہا تھا تب صغریٰ کو نجمی کا خیال آیا۔ اس نے اِدھر اُدھر دیکھا' نجمی پر نظر پڑتے ہی چلائی۔ "ارے......... اسے تو بلاؤ' یہاں لاؤ یہ لڑکی کا باپ ہے۔"

کچھ لوگوں نے بھیڑ ہٹائی اور نجمی کا ہاتھ پکڑ کر اسے ٹیکسی تک لے آئے "بیٹھ بابا" ایک طرف وہ بیٹھا اور دوسری طرف صغریٰ' زیبا کا سر نجمی کی گود میں تھا۔ وہ زیبا کا سر سہلاتا رہا۔ "کیا ہوا میری بٹیا' کیا ہوا رانی؟" وہ خود کلامی کر رہا تھا پھر اس نے صغریٰ سے پوچھا۔ "کیا بات ہے خالہ؟ یہ بولتی کیوں نہیں؟"

"بے ہوش ہو گئی ہے بیٹا۔" صغریٰ نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ "بس نے ٹکر مار دی........"

نجمی اچھل پڑا۔ "کیا زیادہ چوٹ تو نہیں آئی؟ میری زیبا......... میری جان......... ہم کہاں جا رہے ہیں؟"

"عباسی شہید اسپتال۔" صغریٰ نے گلوگیر آواز میں بتایا۔

اسپتال کا نام سنتے ہی نجمی کے وجود میں سناٹے تیر گئے۔ "عباسی شہید اسپتال؟" وہ بڑبڑایا۔

ایمرجنسی وارڈ میں ہمیشہ کی طرح ایمرجنسی ہی تھی۔ مریضوں اور زخمیوں کی کراہیں اور چیخیں تھیں۔ ان کے متعلقین کا شور تھا۔ ڈیوٹی پر صرف ایک ڈاکٹر تھا۔ وہ بری طرح پریشان تھا کہ کس کو دیکھے اور کسے نہ دیکھے۔ وہ ایک مریض کو دیکھ رہا ہوتا تو دوسرے کے متعلقین اس کی آستین کھینچ رہے ہوتے۔ بے چارہ ڈاکٹر اِدھر سے اُدھر پھر رہا تھا۔

زیبا کو ایک بینچ پر ڈال دیا گیا تھا' صغریٰ اور نجمی بے بسی کی تصویر بنے آس پاس کھڑے تھے۔ وہ اب بھی بے ہوش تھی۔

اچانک وہاں سے گزرتے ہوئے ڈیوٹی ڈاکٹر کی نظر زیبا کے چہرے پر پڑی۔ وہ بری طرح ٹھٹکا۔ اس کے چہرے پر ایسے تاثرات تھے' جیسے زیبا کو وہاں دیکھ کر اسے شاک لگا

ہو۔ "اس کے......... اس کے ساتھ کون ہے؟" وہ لہجے سے گڑبڑایا ہوا لگ رہا تھا۔

صغریٰ جلدی سے بولی۔ "میں ہوں' اور یہ اس کا باپ ہے۔" اس نے نجمی کی طرف اشارہ کیا۔

"کیا ہوا ہے؟" ڈاکٹر نے پوچھا اور پھر دوسرے مریضوں کے متعلقین پر برس پڑا جو اسے گھیرے کھڑے تھے۔ "آپ لوگ بھیڑ نہ لگائیں۔ مجھے اس مریض کو دیکھنے دیجئے۔ اس کے بغیر میں یہاں سے نہیں ہلوں گا۔"

بھیڑ تو نہیں چھٹی۔ البتہ کچھ سکون ہو گیا۔ اکلوتے ڈیوٹی ڈاکٹر سے الجھنے کی کسی کو ہمت نہ ہوئی۔

"اسے کیا ہوا بڑی بی؟" اس نے قریب کھڑی صغریٰ سے پوچھا۔

"ایکسیڈنٹ ہوا ہے" صغریٰ نے جواب دیا۔ "بس سے۔"

"تب تو یہ پولیس کیس ہے۔ پولیس رپورٹ سے پہلے ہم اسے ہاتھ نہیں لگا سکتے۔"

صغریٰ سہم گئی۔ جب تک پولیس میں رپورٹ نہ درج ہو' ڈاکٹر ایسے مریضوں کو ہاتھ بھی نہیں لگاتے۔ وہ کچھ کہنے ہی والی تھی کہ ڈاکٹر بول پڑا۔ "خیر......... یہ بتاؤ چوٹ کہاں آئی ہے؟"

"میرا خیال ہے سر پر........."

ڈاکٹر جھک کر زیبا کا معائنہ کرنے لگا۔ "ایکسیڈنٹ کے بعد سے مسلسل بے ہوش ہے؟"

"جی ہاں۔"

"کتنی دیر ہوئی ہو گی؟"

"پون گھنٹا ہو گیا........."

"سر کی چوٹ میں بے ہوشی خطرناک ہوتی ہے۔" ڈاکٹر بڑبڑایا پھر بولا۔ "دیکھئے میں انہیں ایڈمٹ کر رہا ہوں۔ ہم انہیں انڈر آبزرویشن رکھیں گے۔"

"بہت شکریہ ڈاکٹر صاحب۔"

زیبا کو انتہائی نگہداشت کے کمرے میں لے جایا گیا۔ وہاں جانے کی کسی کو اجازت

نہیں تھی۔ صغریٰ اور نجمی باہر کھڑے رہے دونوں مہربلب تھے' اپنی سوچوں میں گم۔ نجمی جو کچھ سوچ رہا تھا' وہ اگر صغریٰ کو معلوم ہو جاتا تو وہ یہی سمجھتی کہ صدمے سے اس کا دماغ ماؤف ہو گیا ہے حالانکہ وہ پوری طرح اپنے حواسوں میں تھا۔ وہ اس وقت بہت حقیقت پسندی سے سوچ رہا تھا۔ بیٹی کی محبت اپنی جگہ' لیکن وہ جانتا تھا کہ اس بوجھ کو وہ عمر بھر اٹھا بھی نہیں سکتا اور پھر زندگی کا کیا بھروسہ! وہ کس پر چھوڑ کر جائے گا اسے؟ دور دور تک بھی یہ امکان نہیں تھا کہ وہ یہ بوجھ کسی اور کو منتقل کر سکے گا پھر وہ بیٹی کچھ نہ ہوتے ہوئے بھی ایک ایسا خزانہ تھی' جس کی وہ آنکھوں سے محروم ہونے کے باعث پاسبانی بھی نہیں کر سکتا تھا۔ اس کے لئے تو اس نے خدا کے سامنے جھولی پھیلائی تھی کہ اس کے لئے رشتہ آ جائے! لیکن کیا ضروری تھا کہ اس کی دعا مقبول بھی ہو جائے! ایسے میں یہ حادثہ تائید غیبی ہی تھا۔ اس کے نتیجے میں مسئلہ حل بھی ہو سکتا تھا۔ اگر..........

اپنی اس سوچ پر ایک لمحے کو اس کی روح بھی لرز کر رہ گئی۔ بیٹی......... پھول سی بیٹی کی موت کی خواہش! لیکن پھر اس کی سوچ نے پلٹا کھایا۔ اس کے سوا حل ہے ہی کیا؟ ذلت کی زندگی سے عزت کی موت لاکھ درجے بہتر ہوتی ہے۔ پہلی بار تو خدا نے میرے حق میں کوئی سبیل پیدا کی ہے۔ اس نے سوچا' میں نے دعا ہی غلط کی تھی۔ زیبا کے لئے رشتہ مانگنا میری حماقت تھی۔ مجھے بیٹی کی موت کی دعا کرنی چاہئے تھی......... اسے جھرجھری آ گئی۔

صغریٰ ڈاکٹر کے اس رویے کے بارے میں سوچ کر الجھ رہی تھی۔ وہ خود اسپتال میں رہی تھی۔ ایمرجنسی کی صورت حال سے بھی واقف تھی۔ وہاں تو کوئی پوچھنے والا ہی نہیں ہوتا۔ اس نے دیکھا کہ ڈاکٹر زیبا کو دیکھ کر چونکا تھا اور اس کے بعد ہی اس نے زیبا پر توجہ دی تھی اور وہ حیران رہ گئی تھی۔ وہ سوچتی رہی اور الجھتی رہی۔ اس بات کا کوئی امکان نہیں تھا کہ ڈاکٹر نے زیبا کو پہلے کہیں دیکھا ہو۔

"مریضہ کو ہوش آ گیا ہے۔" ڈاکٹر نے انہیں چونکا دیا۔ "اب پریشانی کی بظاہر کوئی بات نہیں۔ پھر بھی احتیاطاً میں اسے وارڈ میں بھجوا رہا ہوں۔ دو ایک دن وہاں رہے گی وہ........."

"ہم اسے مل سکتے ہیں؟" صغریٰ نے پوچھا۔

"وارڈ میں مل لیجئے گا۔"

دس منٹ بعد زیبا کو وارڈ میں منتقل کر دیا گیا۔ نجمی اور صغریٰ اس سے جا کر ملے۔ وہ ہوش میں تھی۔

"بابا' پریشان نہ ہونا۔ میں بالکل ٹھیک ہوں۔" وہ بولی اسے باپ کی دلی کیفیت کا علم نہیں تھا۔ اسے کیا معلوم کہ اس کے بابا کے ذہن میں جوار بھاٹا ہے۔

"بس......... اب آپ لوگ جائیں۔" ڈاکٹر نے وارڈ میں آ کر کہا۔ "مریضہ کو آرام کرنے دیں۔ آپ صبح ان سے ملنے آ سکتی ہیں۔ البتہ بڑے صاحب کو ملاقات کے اوقات میں آنا ہوگا......... شام چار بجے سے چھ بجے کے درمیان۔ یہ لیڈیز وارڈ ہے نا۔"

دونوں گھر آ گئے۔ ان کی بھوک اڑ چکی تھی۔ سو وہ بغیر کھائے سو گئے۔ نجمی کو خود امید نہیں تھی کہ وہ اتنی پرسکون نیند سو سکے گا۔ اسے احساس ہوا کہ یہ اس کے خدا پر مکمل یقین کی وجہ سے ہے۔ اس نے اپنا ہر معاملہ' ہر مسئلہ خدا پر چھوڑ دیا تھا۔ صبح صغریٰ ناشتا لائی۔ اس کا خیال تھا کہ نجمی حجت کرے گا مگر ایسا نہیں ہوا۔ نجمی نے بڑے سکون سے ناشتہ کیا۔ ناشتے کے بعد صغریٰ نے پوچھا۔ "نجمی بیٹا تو گھر پر ہی رہے گا یا میرے ساتھ چلے گا؟"

"کہاں خالہ؟"

"اسپتال اور کہاں!" صغریٰ نے حیرت سے کہا۔ "نہ جانے بچی کس حال میں ہو گی۔"

"انشاء اللہ سب ٹھیک ہی ہو گا خالہ۔"

صغریٰ کی حیرت دوچند ہو گئی۔ وہ اسے منہ کھولے دیکھتی رہی۔ یہ کیسی کایا کلپ ہے۔ کہیں مسلسل صدمات کے بعد بیٹی کے ایکسیڈنٹ نے اس کا دماغ تو نہیں الٹ دیا؟ اتنی بے فکری' ایسی بے نیازی.........!

"خالہ' میں اسپتال جا کر کیا کروں گا۔ ملاقات تو ہو نہیں سکتی۔" نجمی نے کہا۔

"ہاں یہ تو ہے۔ تجھے تو باہر رکنا پڑے گا۔"

"نہیں خالہ، میں تو دھندے پر جاؤں گا۔ مجھے شام کو اسپتال لے چلنا۔"

صغریٰ نے اس کی دکان داری کا سامان لیا اور اسے لے کر گھر سے نکل آئی۔ اسے درخت کے نیچے چھوڑ کر وہ کام والے گھر گئی۔ وہاں زیبا کے حادثے کا بتایا اور چھٹی لے کر اسپتال کی طرف چل دی۔

"ڈاکٹر صاحب نے میرا بہت خیال رکھا ہے۔" زیبا نے بتایا۔ "میں نے چھٹی کا کہا تو منع کر دیا۔ کہنے لگے، کم از کم دو دن اور رکنا ہوگا۔"

"کسی چیز کی ضرورت تو نہیں بیٹی؟" اس نے پوچھا۔

"نہیں نانی، بابا کیسے ہیں؟ بہت پریشان ہوں گے وہ؟"

"پریشان تو ہے لیکن خود پر قابو پائے ہوئے ہے۔ شام کو لے کر آؤں گی اسے۔"

صغریٰ وارڈ سے نکلی تو باہر ڈاکٹر یوں کھڑا ملا جیسے اس کا منتظر ہو۔ صغریٰ پریشان ہو گئی۔

"اماں، مجھے تھوڑا سا وقت دے سکیں گی آپ؟" ڈاکٹر نے کہا۔

"ہاں کیا بات ہے ڈاکٹر صاحب۔"

"یہاں نہیں۔ کمرے میں چلیں۔ مجھے آپ سے بہت اہم بات کرنا ہے۔"

صغریٰ کا دل دھڑکنے لگا۔ اس نے درست ہی محسوس کیا تھا کہ کوئی بات ہے ضرور۔ بہرحال یہ اچھی بات تھی کہ جو کچھ بھی تھا اب سامنے آنے والا تھا۔ کہیں زیبا کو کوئی اندرونی چوٹ تو نہیں آئی؟ خدانخواستہ اس کے بارے میں کوئی پریشانی کی بات تو نہیں؟ اس کا ذہن اندیشوں سے بھر گیا۔

"بیٹھیے۔" کمرے میں جا کر ڈاکٹر نے کرسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"ڈاکٹر صاحب، زیبا کے بارے میں کوئی پریشانی کی بات تو نہیں؟" اس نے بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

"ارے نہیں اماں۔ اسے انشاء اللہ کچھ نہیں ہوگا۔" ڈاکٹر نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"تو پھر؟" صغریٰ نے شک آمیز نگاہوں سے دیکھا۔

"اماں.......... میں اس کے بارے میں جاننا چاہتا ہوں۔"

"کیوں؟" صغریٰ محتاط ہو گئی۔

"یہ میں بعد میں بتاؤں گا۔"

"نہیں ڈاکٹر صاحب، پہلے مجھے وجہ معلوم ہونی چاہیے۔ آپ اس میں اتنی زیادہ دلچسپی کیوں لے رہے ہیں۔ ہم غریب لوگ ایسی باتوں سے ڈرتے ہیں۔"

ڈاکٹر کا چہرہ متغیر ہو گیا۔ تاہم اس نے بڑے نرم لہجے میں کہا۔ "مجھ پر اعتبار کرو اماں۔ میں تمہیں ایسا ویسا نظر آتا ہوں کیا؟"

"کیا کریں بیٹا، زمانہ ہی ایسا ہے۔" صغریٰ نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔ "اور پرائی چیز کی بڑی ذمہ داری ہوتی ہے۔"

"اماں تم مجھے پہلے اس کے بارے میں بتاؤ۔ پھر میں تمہیں سب کچھ بتا دوں گا۔" ڈاکٹر نے تحمل سے کہا۔ صغریٰ نے چند لمحے ڈاکٹر کو بغور دیکھا اور فیصلہ کیا کہ وہ ایسا نہیں لگتا۔ اچھے خاندان کا شریف آدمی ہے۔ لہٰذا بتانے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ پتا تو چلے کیا بات ہے! اس نے زیبا کے متعلق، جو کچھ جانتی تھی، ڈاکٹر کو بتا دیا۔ ڈاکٹر بڑے غور سے سنتا رہا۔

صغریٰ کے خاموش ہونے پر وہ بولا۔ "اب میرے بارے میں سن لو۔ میرا نام وحیدالدین ہے۔ میں اپنے تایا حمیدالدین صاحب کے پاس ناظم آباد میں رہتا ہوں۔ سوا سال پہلے ہم پر ایک المیہ گزرا، جس کے اثرات سے ہم، خاص طور پر تایا جان اب تک نہیں سنبھل سکے ہیں۔ کار کے حادثے نے میری امی، ابو، تائی جان اور میری تایا زاد بہن صوفیہ کو ہم سے چھین لیا۔ خاندان میں صرف ہم دو ہی افراد بچے۔ میں اور میرے تایا جان۔ تایا جان کا بہت بڑا کاروبار ہے لیکن اب تو وہ زندگی سے ہی دور ہو گئے ہیں۔ انہیں صوفیہ سے بہت محبت تھی۔ اس کی جوان موت نے انہیں زندہ درگور کر دیا ہے۔ خود میں نے تو اپنے آپ کو اسپتال کے لئے وقف کر دیا ہے۔"

اس کے لہجے میں عجیب سا دکھ تھا جس نے صغریٰ کے دل کو چھو لیا۔ اس نے سوچا، رنج و الم، محرومیاں اور موت صرف غریبوں ہی کے لئے نہیں، ان سے دولت والے بھی نہیں بچتے۔ "لیکن بیٹا ہم تمہارے لئے کیا کر سکتے ہیں؟" اس نے نرم لہجے میں پوچھا۔

"آپ لوگ مجھے اور تایا جان کو سکون دے سکتے ہیں۔ ہمیں پھر سے زندہ کر سکتے

ہیں۔"

"وہ کیسے؟"

"زیبا کو ہمیں دے دیجئے۔"

صغریٰ سن ہو کر رہ گئی۔ "یہ کیا کہہ رہے ہو تم؟ اگر اس کے سر پر ایک اندھے باپ کے سوا کوئی نہیں تو اس کا یہ مطلب بھی نہیں کہ وہ بکاؤ مال ہے!" اس کے لہجے میں غضب کی کاٹ تھی۔

"غلط نہ سمجھیں۔ دراصل صورتِ حال ایسی ہے کہ میں ٹھیک طور سے سمجھا نہیں پا رہا ہوں آپ کو۔ کبھی سوچا بھی نہ تھا کہ مجھے کسی سے اس طرح کی کوئی بات کرنا پڑے گی۔ یہ باتیں عورتوں کے درمیان ہوتی ہیں۔ خیر........." ڈاکٹر نے میز کی دراز کھولی اور ایک تصویر نکال کر صغریٰ کی طرف بڑھا دی۔ "آپ ایک نظر اسے دیکھیں ذرا........"

صغریٰ نے ایک نظر دیکھتے ہی بے ساختہ کہا۔ "ارے یہ......... یہ تو زیبا کی تصویر ہے! تمہارے پاس کہاں سے آ گئی؟"

"یہ زیبا کی تصویر نہیں ہے اور یہ بات آپ بھی جانتی ہیں۔ ذرا غور سے دیکھیں........"

صغریٰ کو فوراً ہی احساس ہو گیا تھا کہ زیبا کی تو کبھی کوئی تصویر کھنچی ہی نہیں۔ اس نے تصویر کو دوبارہ دیکھا۔ وہ زیبا نہیں تھی لیکن شکل ہُوبہو زیبا جیسی تھی۔ عمر میں وہ زیبا سے تین چار سال بڑی ہو گی۔ تصویر میں وہ جدید طرز کا لباس پہنے ہوئے تھی۔ ایسا لباس زیبا نے کبھی خواب میں بھی نہیں پہنا ہو گا۔ اگر تصویر والی لڑکی زیبا کے سے سادہ لباس میں ہوتی تو وہ اسے زیبا ہی کی تصویر سمجھتی۔ ڈاکٹر کسی بھی طرح اسے قائل نہ کر پاتا کہ تصویر زیبا کی نہیں ہے۔

"یہ......... یہ تصویر کس کی ہے؟" اس نے پوچھا۔

"یہ میری تایا زاد بہن صوفیہ کی تصویر ہے، جس کی موت نے میرے تایا کو زندہ درگور کر دیا ہے۔" ڈاکٹر وحید نے کہا۔ "اور یہ میری منگیتر بھی تھی۔"

"مجھے بہت دکھ ہوا سن کر۔ مگر بیٹے میں کیا کر سکتی ہوں؟"

"بہت کچھ کر سکتی ہیں۔ میں نے کہا نا، آپ مجھے اور تایا جان کو سکون دے سکتی ہیں۔ انہیں زندہ کر سکتی ہیں پھر سے۔"

"اگر زیبا میری بیٹی یا نواسی ہوتی تو شاید میں کچھ کر سکتی۔" صغریٰ نے دکھ بھرے لہجے میں کہا۔ "لیکن بیٹے، اس پر میرا کوئی حق نہیں، اور اس کا اندھا باپ بہت خوددار ہے۔ اب تو اسے انسانوں پر اعتماد بھی نہیں رہا........."

"لیکن وہ ایک بیٹی کا غریب باپ ہے اماں۔" ڈاکٹر صاحب نے اس کی بات کاٹ دی۔ "کیسی ہی مجبوری سہی، ایک زمانے میں وہ بھیک بھی مانگ چکا ہے۔ یہ زمانہ بھاری جہیز کا ہے اماں۔ بغیر جہیز کے تو حسین ترین لڑکیاں بھی رشتے کے انتظار میں بیٹھے بیٹھے بڑھاپے تک پہنچ جاتی ہیں۔ اگر زیبا کا باپ پڑھا لکھا، سمجھدار آدمی ہے تو وہ یہ بھی سمجھتا ہو گا کہ زیبا کو ایک اچھی زندگی کبھی نہیں دے سکتا۔ لیکن ہم دے سکتے ہیں........."

بھیک کے حوالے پر صغریٰ کی رنگت متغیر ہو گئی۔ "میں تمہیں ایک مشورہ دے سکتی ہوں ڈاکٹر۔" اس نے سرد لہجے میں کہا۔ "زیبا کے باپ سے ملو تو اس انداز میں بات کرنے کی غلطی نہ کرنا۔ وہ ضرورت مند ہے لیکن تم اس سے بہت زیادہ ضرورت مند ہو۔ ضرورت مندوں کو یہ لہجہ راس نہیں آتا۔ میری بات تمہیں کڑوی تو لگے گی........"

"نہیں اماں، تم نے ٹھیک کہا۔" ڈاکٹر نے جلدی سے کہا۔ "اب مجھ پر ایک مہربانی اور کر دو، مجھے زیبا کے بابا سے ملوا دو۔ آج شام وہ زیبا سے ملنے آئیں گے نا؟"

"ہاں، تم آج ہی اس سے بات کر لینا۔ اب میں چلتی ہوں۔"

صغریٰ کے جانے کے بعد ڈاکٹر دیر تک سوچتا رہا۔ اسے ایک لاینحل مسئلے کا حل تو مل گیا تھا لیکن اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ اسے ہینڈل کر بھی سکے گا یا نہیں۔ اس نے تو سوچا تھا، اندھے بھکاری کو کچھ دے دلا کر معاملہ کر لے گا لیکن اب اندازہ ہو رہا تھا کہ اسے بہت سنبھل کر بات کرنا ہو گی اور بڑا مسئلہ تایا جان تھے۔

☆------☆------☆

کام سے واپس جاتے ہوئے صغریٰ نجمی کے پاس گئی۔ اس کا سامانِ دکان داری گھر پہنچوا کر وہ اسے اسپتال کی طرف لے چلی۔ رستے میں اس نے ڈاکٹر کے متعلق بتایا۔

"اس کا یہ کہنے کا کیا مطلب تھا کہ زیبا کو ہمیں دے دیں؟" نجمی نے پوچھا۔

"شادی کے لئے ایسے ہی کہا جاتا ہے۔"

"لیکن خالہ.........."

"تُو تو دکھ سمجھ سکتا ہے بیٹا اس کا۔ اب اس کے گھر میں تو کوئی ہے نہیں جو بات کرے۔ ہے ہے! بھرا گھر اجڑ گیا بے چارے کا۔" صغریٰ نجمی کو ڈاکٹر کے حق میں ہموار کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ وہ چاہتی تھی کہ نجمی کے دل میں ڈاکٹر کے لئے نرم گوشہ پیدا ہو جائے۔

"تو اصولاً بات اس کے تایا کو کرنی چاہیے۔" نجمی نے نکتہ اٹھایا۔

"پہلے تُو اس سے بات کر لے۔"

"ٹھیک ہے خالہ۔"

نجمی کے جسم میں سنسنی سے دوڑ رہی تھی۔ لگتا تھا' خدا نے اس کی سن لی ہے۔ اس کا وجود خوش امیدی سے جیسے بھر گیا تھا۔ اسپتال پہنچ کر وہ زیبا سے ملا۔ ملاقات کا وقت پورا ہونے تک وہ اس کے پاس بیٹھا باتیں کرتا رہا۔ وقت ختم ہونے کی گھنٹی بجی تو وہ وارڈ سے باہر نکل آیا۔ صغریٰ اسے ڈاکٹر کے کمرے میں لے گئی۔ ڈاکٹر نے بڑے تپاک سے نجمی سے مصافحہ کیا اور خیریت دریافت کی۔

"خالہ نے مجھے تمہارے متعلق بتایا۔" نجمی نے کہا۔ "مجھے بہت افسوس ہوا سن کر۔"

"جو ہونا تھا وہ تو ہو گیا بڑے صاحب۔ میرے لئے تو اب کوئی اچھی صورت نکلی ہے۔ میرے لئے تو یہ مقامِ شکر ہے۔"

"میں سمجھا نہیں۔ بہت سی باتیں مجھے خالہ بھی نہیں سمجھا سکیں' تمہارے ذہن میں کیا ہے ڈاکٹر؟"

"زیبا ہُو بہو میری تایا زاد بہن صوفیہ جیسی ہے۔ صوفیہ ہمیں واپس مل جائے تو میں اور تایا جان پھر سے جی اٹھیں گے۔"

"کھل کر بات کرو ڈاکٹر وحید۔"

"صوفیہ میری منگیتر تھی' اس سے میری شادی ہونے والی تھی۔ تایا جان کی وہ اکلوتی اولاد تھی۔" ڈاکٹر وحید نے کہا۔ وہ اس اندھے شخص سے مرعوب ہو گیا تھا۔ اس کا لب و لہجہ نہ صرف اس کے تعلیم یافتہ ہونے کی غمازی کر رہا تھا بلکہ اس میں وہ رچاؤ بھی تھا' جو زندگی کو ہر روپ میں بہت قریب سے دیکھنے والوں ہی کو میسر آتا ہے۔ نجمی خاموش بیٹھا رہا۔ وہ خاموشی کہہ رہی تھی کہ ابھی اس کے نزدیک ڈاکٹر کی بات مکمل نہیں ہوئی ہے۔

ڈاکٹر وحید چند لمحے خاموش رہا پھر اس نے ڈرتے ڈرتے کہا۔ "میں زیبا سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔"

اندھے نجمی کے لئے وہ لمحہ ایسا تھا' جیسے اسے اس کی کھوئی ہوئی بینائی مل گئی ہو۔ زندگی کی سب سے بڑی خوشی اس کے سامنے بانہیں پھیلائے کھڑی تھی۔ اس نے بے حد شفقت سے کہا۔ "لیکن بیٹے' ایسی باتیں یوں نہیں کی جاتیں' زندگی کے ہر کام کے کچھ آداب ہوتے ہیں' کوئی سلیقہ ہوتا ہے۔ یہ بات یہاں' اسپتال میں تمہیں مجھ سے نہیں کرنی چاہئے تھی۔ یہ بات میرے گھر میں' تمہارے تایا جان کے منہ سے اچھی لگتی.........."

"آپ درست فرما رہے ہیں انکل۔" ڈاکٹر نے جلدی سے کہا۔ "لیکن آپ انسانی مجبوریوں سے مجھ سے زیادہ واقف ہیں۔"

"کس مجبوری کی بات کر رہے ہو؟" نجمی نے پوچھا۔

"جو کچھ میں کہوں گا' اس سے آپ کو توہین کا احساس ہو گا لیکن کہے بغیر چارہ نہیں۔" ڈاکٹر وحید نے عاجزی سے کہا۔

"تم کھل کر بات کرو بیٹے' میں بدترین توہین پہلے ہی جھیل چکا ہوں۔" نجمی کا لہجہ اب بھی شفقت آمیز تھا۔ اس لمحے اسے یاد آ گیا کہ کوئی لفنگا اس کی بیٹی کو نوٹ دکھا رہا تھا۔ اس توہین نے تو اسے پھونک کر رکھ دیا تھا۔ یہ تو رشتے کی بات تھی.......... عزت کی بات!

"بات یہ ہے انکل کہ میں تو انسانوں کے معاملے میں اونچ نیچ کا قائل نہیں ہوں لیکن میرے تایا مختلف آدمی ہیں۔ میرا یہ کہنا بدتمیزی کے مترادف ہو گا لیکن حقیقت یہ

ہے کہ اپنی دولت کے گھمنڈ میں وہ انسان کو انسان نہیں سمجھتے۔ ملازموں اور چھوٹے لوگوں کے ساتھ ان کا برتاؤ بہت خراب ہوتا ہے۔ پھر اس المیے کے بعد وہ چڑچڑے بھی بہت زیادہ ہو گئے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ آپ کے گھر زیبا کا رشتہ مانگنے نہیں آ سکتے بلکہ میں نے انہیں اس سلسلے میں کچھ بتایا بھی نہیں ہے.........."

"تو پھر میری بیٹی کو اس گھر میں بہو اور بیٹی کا مقام کیسے دلوا سکو گے؟" نجمی کا لہجہ تلخ ہو گیا۔

"دیکھئے انکل' صورتِ حال کو دیکھتے ہوئے جہاں تک میں سمجھا ہوں اور اس کا جو میری نظر میں حل ہے' وہ میں آپ کو بتا دیتا ہوں۔ میری کچھ باتیں آپ کو بے رحمانہ لگیں گی لیکن حقیقت پسند بن کر سوچیں گے تو آپ مجھے معاف کر دیں گے۔" ڈاکٹر وحید نے کہا۔ وہ چند لمحے سوچتا رہا کہ بات کہاں سے شروع کرے۔ بالآخر اس نے کہا۔ "لیکن پہلے میں دونوں طرف کے مسائل اور پوزیشن سامنے لے آؤں تو بہتر ہو گا۔ ہمارا مسئلہ یہ ہے کہ اب میرا تایا جان کے سوا اور تایا جان کا میرے سوا دنیا میں کوئی نہیں رہا۔ حادثے کے بعد تایا جان کے اندر جو تھوڑی بہت نرمی تھی' وہ بھی ختم ہو گئی ہے۔ ان کی رعونت اور بد دماغی بڑھ گئی ہے۔ وہ آدم بیزار اور چڑچڑے ہو گئے ہیں۔ کسی سے ملتے جلتے نہیں' کہیں آتے جاتے نہیں۔ بس اپنی کاروباری مصروفیات میں الجھے رہتے ہیں۔ اب ایسے میں اگر انہیں صوفیہ کی ہم شکل مل جائے تو وہ اسے اپنی بہو اور بیٹی کے طور پر قبول کر لیں گے لیکن ایک بات ہے۔ اگر بیٹی کے طور پر ملنے والی زیبا تعلق کی کسی ڈور میں بندھی ہو گی تو وہ جذباتی عدم تحفظ کا شکار رہیں گے اور.......... میری بات کا برا نہ منائیے گا' میں پہلے ہی معذرت کر رہا ہوں' اگر اس تعلق کا بیک گراؤنڈ اچھا نہ ہوا تو وہ ہم شکل ہونے کے باوجود اپنے دل میں اسے بیٹی کا مقام نہیں دے سکیں گے۔" اس نے نظریں اٹھا کر نجمی کے چہرے کو دیکھا جو تمتما رہا تھا۔ "پلیز انکل!" اس نے ملتجیانہ لہجے میں کہا۔ "پہلے میری بات ٹھنڈے دل سے سن لیں۔ آخری فیصلہ تو آپ کو ہی کرنا ہے۔ مجھے یہ عرض کرنا ہے کہ صوفیہ کی ہم شکل لڑکی تعلق اور رشتے کی کسی ڈور سے بندھی نہ ہو' زیبا دنیا میں اکیلی ہو تو تایا جان فطری طور پر تحفظ محسوس کریں گے۔ وہ اسے فوراً ہی بیٹی کا مقام دے

دیں گے' یہ سوچ کر کہ اب وہ ان کی اپنی ہے اور وہ اسے آسانی سے اپنے من پسند رنگ میں رنگ سکتے ہیں۔"

"لیکن یہ.........."

"پلیز انکل' پہلے مجھے بات پوری کرنے دیں۔ اس کے بعد میں آپ کے ہر سوال کا جواب دینے کی کوشش کروں گا۔ دوسری طرف میں ہوں۔ میں صوفیہ سے محبت کرتا تھا۔ میری اس سے شادی ہونے والی تھی۔ میں نے زیبا کو جو تھوڑا بہت دیکھا ہے تو اس سے مطمئن ہوں۔ میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ وہ میری صوفیہ سے کسی طرح کم نہیں بلکہ بہتر ہی ہے۔ تیسری طرف آپ ہیں۔ آپ کو اپنی بیٹی کے مستقبل کی فکر ہے۔ آپ اسے محرومیوں سے بچا کر خوشیوں بھری زندگی دینا چاہتے ہیں۔ آپ سے مل کر' آپ کی گفتگو سن کر میں نے اندازہ لگایا کہ آپ پڑھے لکھے سلجھے ہوئے انسان ہیں' جسے وقت اور مقدر کی سختیاں بھی نہیں کچل سکی ہیں' لیکن آپ وسائل سے محروم ہیں۔ سو انکل' میں وہ شخص ہوں جو آپ کی بیٹی کو ایک گھر' عزت کی زندگی' محبت اور خوشیاں دے سکتا ہے۔ میں آپ سے وعدہ کرتا ہوں کہ زیبا کو اپنی بساط سے زیادہ خوشیاں دوں گا۔ اس کا دل کبھی میلا نہیں ہونے دوں گا۔ یوں دونوں طرف کے مسئلے بخوبی حل ہو سکتے ہیں.........."

نجمی کے وجود میں آندھیاں سی چل رہی تھیں۔ پھر بھی اس نے بے حد ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ "تم زیبا کو دنیا میں اکیلی کس طرح بتا سکو گے؟"

"میں معذرت چاہتا ہوں۔ میری بات آپ کو سفاکانہ لگے گی لیکن مسئلے کا حل یہی ہے۔ میں زیبا کو اپنے ساتھ لے جاؤں گا اور تایا جان سے کہوں گا کہ میں اسے کسی رفاہی ادارے سے لایا ہوں.......... صرف اس لئے کہ یہ صوفیہ کی ہم شکل ہے۔"

نجمی کا چہرہ ست گیا۔ صغریٰ کے چہرے پر ہوائیاں اُڑ رہی تھیں۔ وہ بار بار ملتجیانہ نظروں سے ڈاکٹر وحید کی طرف دیکھ رہی تھی لیکن وہ دانستہ اس کی طرف دیکھنے سے گریز کر رہا تھا۔

"سرجن ہو نا!" بالآخر نجمی کے لب ہلے۔ اس کا لہجہ بہت دھیما تھا۔ "گلے سڑے ناکارہ اعضاء کو ایک منٹ میں کاٹ کر جسم سے علیحدہ کر دینے کے قائل۔ جذباتیت سے

پاک.........."

"میں پہلے ہی معذرت کر چکا ہوں انکل۔"

"اچھا ایک بات بتاؤ لیکن پہلے یہ بتا دوں کہ ہم صرف مفروضوں پر بات کر رہے ہیں۔ اگر تمہارے تایا جان نے زیبا کو پھر بھی قبول نہ کیا تو کیا ہوگا؟"

"میں اپنے طور پر ایک مکمل اور آزاد مرد ہوں انکل۔" ڈاکٹر وحید نے مضبوط لہجے میں کہا۔ "اس صورتِ حال میں، میں تایا جان کو چھوڑ دوں گا اور زیبا کے ساتھ اپنا گھر بسا لوں گا۔ میرے ضمیر پر کوئی بوجھ نہیں ہوگا کیونکہ میں نے تایا جان کو خوشیاں لوٹانے کی بڑی سچی کوشش کی ہوگی لیکن مجھے یقین ہے کہ ایسا نہیں ہوگا۔ تایا جان خود میری اور زیبا کی شادی کرائیں گے، خوشی سے۔"

"تمہارا مطلب ہے، زیبا سے تمہاری شادی تمہارے گھر پر ہوگی۔"

"یہ مجبوری ہے انکل۔"

"اور میں اس شادی میں شریک بھی نہیں ہوں گا؟"

ڈاکٹر وحید نے کوئی جواب دینے کے بجائے سر جھکا لیا۔

"چل نجمی، چلیں یہاں سے۔" صغریٰ نے غصے سے کہا۔ "اب برداشت نہیں ہوگا مجھ سے۔"

"نہیں خالہ، لڑکی والوں کو بہت کچھ سننا پڑتا ہے اور پھر میری زیبا تو ہے ہی بدنصیب.........." نجمی نے بجھے دل سے کہا۔

"ایسا نہ کہیں انکل۔" وحید نے التجا کی۔ "آپ سمجھنے کی کوشش کریں۔"

"کر رہا ہوں.......... بڑے خلوص سے کر رہا ہوں۔" نجمی نے بڑے ٹھنڈے لہجے میں کہا۔ "تم یہ کہنا چاہتے ہو کہ میری بیٹی میری چوکھٹ سے وداع نہیں ہوگی؟"

"جی انکل۔"

"اور میں شادی کے بعد اپنی بیٹی سے نہیں مل سکوں گا؟"

"باپ کی حیثیت سے نہیں، لیکن ایسا زیادہ عرصے تک نہیں ہوگا۔ کچھ عرصہ بعد جب تایا صوفیہ کی حقیقت قبول کر لیں گے تو ہم انہیں سب کچھ بتا دیں گے۔ پھر وہ حجت

نہیں کریں گے۔ ظاہر ہے، زیبا کو کھونا انہیں گوارا نہیں ہوگا۔"

"مجھے بہلاوا دے رہے ہو!" نجمی نے تیز لہجے میں کہا۔

ڈاکٹر وحید کی نظریں جھک گئیں۔

"اور تمہارے خیال میں یہ دونوں طرف کے مسائل کا حل ہے؟ میں تمہیں جانتا نہیں، پہچانتا نہیں۔ بغیر شادی کے اپنی معصوم بیٹی کا ہاتھ تمہارے ہاتھ میں دے دوں؟ اور اس سے کہوں بیٹی، اس شخص کے ساتھ چلی جا اور بھول جا کہ تیرا کوئی باپ بھی تھا۔ یہی چاہتے ہو تم؟"

"دیکھئے انکل.......... لڑکے والے جہیز کے نام پر طرح طرح کے مطالبے کرتے ہیں اور لڑکی کے والدین سو سو جتن کر کے انہیں پورا کرتے ہیں۔ سمجھ لیں، میں آپ سے صرف یہی کچھ مانگ رہا ہوں.........."

نجمی اب تک انگاروں پر کھڑا تھا اور ان انگاروں کی تپش اس کے پورے وجود کو دہکا رہی تھی۔ اس کی انا اس کے دماغ میں پھن کاڑھ کر کھڑی ہو گئی تھی اور پھنکار رہی تھی، لیکن اس کی حقیقت پسندی نے اسے ان پھنکاروں کی طرف سے کان بند کرنے پر مجبور کر دیا تھا۔ اس تمام گفتگو کے دوران سننے کے ساتھ ساتھ وہ سوچتا بھی رہا تھا۔ اگر بیٹی کا گھر بس جائے اور وہ ہنسی خوشی عزت کے ساتھ زندگی گزارے تو اس کے عوض وہ مر بھی سکتا ہے۔ اب زندگی میں اور تھا ہی کیا! پھر اس نے خدا سے کہا تھا.......... جیسا بھی ہو، میں تجھ سے اپنی بیٹی کے لئے ایک رشتے کا سوال کرتا ہوں۔ وعدہ کرتا ہوں اس میں نخرے نہیں کروں گا۔ پہلے ہی رشتے کو تیری نعمت سمجھ کر قبول کر لوں گا.......... مگر یہ کیسا رشتہ ہے کہ بیٹی دلہن بن کر اس کے گھر سے وداع نہیں ہو رہی ہے بلکہ یوں لے جائی جا رہی ہے جیسے نیلامی میں بولی سے چھڑائی گئی کوئی چیز۔ دوسری طرف اگر یہ رشتہ تھا تو ایسا رشتہ جس کا وہ تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔ شاید وہ خدا کی طرف سے نعمت ہی تھی۔

بہر حال ایک بات تھی۔ ڈاکٹر وحید اپنی باتوں سے، اپنے لہجے سے اسے کھرا آدمی معلوم ہو رہا تھا پھر بھی.......... اسے وہ شخص یاد آیا جو اس کے نوٹ بدلوانے لے گیا تھا، جس نے اسے بھیک مانگنے پر مجبور کر دیا تھا۔ وہ نوٹ تھے، یہ بیٹی تھی.......... اس کی عزت،

اس کی آبرو' آنکھوں سے محروم آدمی کسی پر اعتبار کر سکتا ہے؟

دل نے کہا۔ ہاں' خدا پر کر سکتا ہے اور کرنا چاہئے۔ تم نے جو اس سے مانگا تھا' وہ اس نے تمہیں دے دیا۔ اب کیوں کفرانِ نعمت کرتے ہو۔ اور وہ ایک نتیجے پر پہنچ گیا۔

"ٹھیک ہے بیٹے۔" اس نے کہا۔ "میں تمہارا منہ مانگا جہیز دینے پر تیار ہوں۔ میں شادی کے بعد کبھی بھی اس سے نہیں ملوں گا لیکن ایک شرط میری بھی ہے۔"

"فرمائیں انکل۔"

"تم چاہے چار آدمی ساتھ لے کر آؤ لیکن تمہیں میرے گھر آ کر نکاح کرنا اور میری زیبا کو رخصت کر کے لے جانا ہوگا۔"

"لیکن انکل.........."

"اس کے بعد تم گھر جا کر اپنے تایا سے کچھ بھی کہنا' مجھے کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔ وہاں چاہے تم دوبارہ شادی کر لینا۔ میرا اپنی بیٹی کو شادی کر کے وداع کرنے کا ارمان پورا ہو جائے گا۔"

ڈاکٹر وحید چند لمحے سوچتا رہا۔ پھر اس نے کہا۔ "ٹھیک ہے انکل' مجھے منظور ہے۔ یہ نہ ہوا تو یہ آپ کے ساتھ زیادتی ہوگی۔"

"شکریہ بیٹے۔"

"میں کل اماں کو لے جا کر اپنا گھر دکھا دوں گا۔ بعد میں یہ جب چاہیں' آ کر زیبا سے مل کر اس سے اس کی خیریت دریافت کر سکیں گی لیکن آپ یقین رکھیں آپ کی بیٹی کو کوئی تکلیف نہیں ہوگی۔"

"اللہ مالک ہے۔"

"کل زیبا اسپتال سے رخصت ہو جائے گی۔ پرسوں میں چند دوستوں کے ساتھ آپ کے گھر آ جاؤں گا۔ ابھی میں آپ کے ساتھ چل رہا ہوں' آپ کا گھر دیکھ لوں گا۔"

ڈاکٹر وحید انہیں اپنی کار میں گھر چھوڑنے آیا۔ صغریٰ اور نجمی نے اصرار کر کے اسے چائے پلائی۔

"کل شام زیبا کو آ کے لے جایئے گا۔" ڈاکٹر نے رخصت ہوتے ہوئے کہا۔ "اور

اماں' آپ صبح گیارہ بجے تیار رہئے گا۔ میں آپ کو اپنا گھر بھی دکھا دوں گا۔ ملوانے کے لئے وہاں نوکروں کے سوا تو کوئی ہوگا نہیں۔"

ڈاکٹر کے جانے کے بعد صغریٰ نے نجمی سے کہا۔ "بیٹے تُو نے بہت جلد بازی کی.........."

"نہیں خالہ' میں نے بہت سوچ سمجھ کر' ٹھنڈے دل سے فیصلہ کیا ہے۔"

"پھر بھی.........."

"دیکھو خالہ' دھڑکا صرف ایک ہی ہے نا کہ کہیں یہ دھوکا نہ ہو' تو کل تم جا کر اس کا گھر دیکھ لو گی۔ بہت کچھ اندازہ ہو جائے گا۔ ویسے بھی وہ بڑے اسپتال کا بڑا ڈاکٹر ہے' کوئی گمنام آدمی تو ہے نہیں۔"

"خیر.......... اس کے متعلق میں اسپتال سے بھی کچھ پوچھ گچھ کروں گی۔ گھر بھی دیکھ آؤں گی لیکن بیٹا.........."

"بعد کی بات کر رہی ہو نا خالہ' تو میں جانتا ہوں کہ ہر چیز کی کوئی قیمت ادا کرنا پڑتی ہے آدمی کو اور میرے نزدیک یہ سودا مہنگا نہیں۔ ویسے ہی میں کون سا دیکھ سکتا ہوں اپنی بیٹی کو؟ تم اس سے مل آیا کرنا اور بتا دیا کرنا کہ وہ خوش ہے۔ مجھے اور کیا چاہئے۔"

"لیکن یہ بھی سوچا ہے کہ زیبا.........."

"اسے تم سمجھا دینا خالہ۔ وہ بہت سمجھ دار ہے اور ہر بات مان بھی لیتی ہے۔ پھر میں بھی سمجھا دوں گا۔"

"ٹھیک ہے' اب میں کھانا پکاتی ہوں۔ تجھے بھوک لگ رہی ہوگی۔"

☆======☆======☆

اس رات نجمی کو پتا چلا کہ دکھ تو جیسا بھی ہو، آدمی کو تھپکیاں دے دے کر سلا دیتا ہے لیکن خوشی میں نیند بالکل اُڑ جاتی ہے وہ ایک پل بھی نہ سو سکا۔ صبح کا انتظار کرتا رہا۔ اس کا بس چلتا تو وقت کو اڑاتا اور اس شام کو جلدی سے اپنے دروازے پر لے آتا، جس شام اس کی بیٹی کو وداع ہونا تھا۔

صبح صغریٰ نے اسے ناشتہ کرایا اور اس کا سامان لے کر اس کے ٹھکانے پر چھوڑنے کے لئے آئی۔

"اب میں چلتی ہوں نجمی۔"

"ڈاکٹر وحید کا گھر دیکھنے جاؤ گی نا؟"

"ہاں بیٹے۔"

"اور دوپہر کا کھانا لاؤ گی نا؟"

"ہاں، اور ڈاکٹر کے گھر کا حال بھی بتا دوں گی۔" صغریٰ نے ہنستے ہوئے کہا۔ نجمی جھینپ گیا۔ اسے کھانے سے اتنی دلچسپی نہیں تھی، جتنی صغریٰ کی رپورٹ سے تھی۔ صغریٰ نے یہ بات بھانپ لی تھی۔

اسے دوپہر تک کا وقت کاٹنا دوبھر ہو گیا۔ خوشی میں اندیشے ایسے گھل مل گئے تھے کہ اس سے کچھ سوچا بھی نہیں جا رہا تھا۔ بس ایک اضطرار سا تھا، جو اس پر طاری تھا۔ بالآخر صغریٰ کھانا لے آئی۔

"لے نجمی تُو کھانا کھاتا جا اور میں تجھے ڈاکٹر کے گھر کا حال سناتی جاؤں۔" وہ بولی۔

نجمی بے دلی سے نوالے لیتا رہا۔ صغریٰ نے ہیجانی لہجے میں کہنا شروع کیا۔ "بہت بڑا

گھر ہے ڈاکٹر کا۔ میرے تیرے گھر کو ملایا جائے تو اس سے دوگنا باغیچہ ہے اس کا۔ بہت سارے کمرے ہیں۔ بہت خوبصورت! سامان سے بھرا گھر ہے۔ بس اس میں نوکر ہی نوکر رہتے ہیں۔ باورچن الگ ہے۔ مالی ہے، صفائی کرنے والی دو عورتیں ہیں۔ ڈرائیور ہے اور ان سب کے کوارٹر بھی بنگلے ہی میں بنے ہوئے ہیں۔"

نجمی کی رگوں میں خون کی گردش تیز ہو گئی۔ "تمہیں یقین ہے کہ وہ بنگلہ اسی کا ہے خالہ؟"

"کیا مطلب؟"

"مطلب یہ کہ.......... یہ بھی ہو سکتا ہے اس نے کسی جاننے والے کا بنگلہ تمہیں دکھایا ہو۔"

"نہیں وہ بنگلہ اس کا ہے۔ وہ وہاں رہتا ہے۔"

"یہ تم کیسے کہہ سکتی ہو خالہ؟"

"ارے پگلے تمام نوکر اسے چھوٹے صاحب کہتے ہیں۔"

"اس سے کیا ہوتا ہے! مالک کے دوست کے بیٹے کو بھی چھوٹے صاحب کہا جا سکتا ہے۔"

"گھر میں اس کی تصویریں لگی ہیں، ایک منگیتر کے ساتھ بھی تھی۔"

نجمی کو اطمینان ہو گیا۔ اس کے دل میں کسی نے کہا.......... اے اللہ، تیرا شکر ہے۔

"تم مطمئن ہو خالہ؟"

"ہاں۔ تُو کل مطمئن تھا اور میں آج ہوئی ہوں۔" صغریٰ نے کہا۔

"تب ٹھیک ہے خالہ۔"

"شام کو اسپتال چلے گا زیبا کو لینے؟"

"نہیں خالہ، تم لے آنا اور واپسی میں مجھے ساتھ لے چلنا گھر۔"

"ٹھیک ہے۔"

اب نجمی کی عجیب کیفیت تھی۔ اندیشے چھٹ گئے تھے تو بے یقینی آ گئی تھی۔ وہ سوچ رہا تھا کہ ڈاکٹر وحید اپنا ارادہ تو نہیں بدل لے گا۔ اسی کشمکش میں شام ہو گئی۔ صغریٰ

زیبا کو رکشے میں لے آئی۔ زیبا نے باپ کو سلام کیا۔

"کیسی ہے بیٹی؟ کوئی تکلیف تو نہیں؟ کہیں درد تو نہیں؟"

"میں بالکل ٹھیک ہوں بابا۔"

"بالکل ٹھیک؟"

"بالکل ٹھیک بابا' ڈاکٹر صاحب اجازت دے دیتے تو میں اسی روز گھر آ جاتی۔ مجھے تو کچھ ہوا ہی نہیں تھا۔"

"چل نجمی' اب گھر چلیں' باقی باتیں وہیں کر لینا۔ زیبا بالکل ٹھیک ہے۔" صغریٰ نے کہا۔

گھر پہنچ کر زیبا نے صغریٰ سے پوچھا۔ "میں کھانا پکا لوں نانی؟"

نجمی نے احتجاج کیا مگر صغریٰ نے اسے سمجھا دیا۔ "میں نے ڈاکٹر سے بھی پوچھ لیا تھا۔ وہ کہہ رہے تھے' زیبا بالکل ٹھیک ہو گئی ہے۔"

پھر وہ زیبا کی طرف مڑی۔ "جا بیٹا' تو دال چڑھا دے جا کر۔" زیبا باورچی خانے میں گئی تو وہ کہنے لگی۔ "نجمی میں نے اسپتال میں بھی پوچھ تاچھ کی تھی۔ ڈاکٹر تین سال سے اس اسپتال میں ہے۔ سب لوگ' چھوٹے کیا اور بڑے کیا' اس کی شرافت کے گن گاتے ہیں۔ میں تو سمجھتی ہوں' اللہ نے ہماری زیبا کی تقدیر ہی بدل دی ہے۔"

"اللہ تیرا شکر ہے۔" نجمی نے بے ساختہ کہا۔

"اور ڈاکٹر وحید کہہ رہے تھے کہ وہ کل شام چھ بجے اپنے دوستوں کے ساتھ آئیں گے۔ قاضی صاحب ان کے ساتھ ہوں گے۔"

"اللہ تیرا شکر ہے۔" نجمی نے دہرایا پھر چونک کر پوچھا۔ "خالہ ہمیں کچھ کپڑوں کا تو بندوبست کرنا ہو گا اور کوئی زیور.........."

"ڈاکٹر صاحب کہہ رہے تھے اس کی کوئی ضرورت نہیں اور بیٹا' وہ اسے دلہن بنا کر گھر تھوڑا ہی لے جائیں گے۔ سرخ جوڑا اور زیور تو وہ وہیں پہنے گی' اس دکھاوے کی شادی میں۔"

"ہاں.......... میں تو بھول ہی گیا تھا خالہ۔" نجمی اداس ہو گیا۔ "لیکن کھانے کا تو کچھ

کرنا ہو گا۔"

"ڈاکٹر صاحب کہہ رہے تھے کہ یہ وقت انہوں نے اسی لئے رکھا ہے۔ ساڑھے سات بجے تک واپس چلے جائیں گے وہ۔ نکاح شربت پر ہو گا' کھانے کا تو وقت ہی نہیں ہو گا وہ۔"

"یہ بھی ٹھیک ہے خالہ۔ پر زیبا کے لئے ایک اچھا سا نیا جوڑا ضرور لیں گے ہم۔ ان کپڑوں میں رخصت کریں گے اسے۔ اور خالہ' بستی کے دو چار لوگوں کو ضرور بلا لینا بلکہ مجھے لے چلنا' میں خود بلاوا دوں گا انہیں۔"

"تو کوئی فکر نہ کر نجمی' زیبا کے لئے نئے کپڑے بھی آئیں گے' اس کے ہاتھوں میں مہندی بھی لگے گی اور لڑکیاں گیت بھی گائیں گی شادی کے۔"

"اور خالہ.......... تم نے زیبا سے بات کر لی ہے؟"

"ابھی کرتی ہوں جا کر۔" صغریٰ نے کہا اور اٹھ کر باورچی خانے کی طرف چلی گئی۔

رات کے کھانے کے بعد اپنے گھر جاتے وقت صغریٰ نے چپکے سے نجمی سے کہا۔

"میں نے زیبا کو سمجھا دیا ہے لیکن وہ بہت پریشان ہو رہی ہے۔ تو بھی اس سے بات کر لینا ذرا پیار سے' ڈھنگ سے سمجھا دینا اسے۔"

"ٹھیک ہے خالہ۔"

صغریٰ کے جانے کے بعد نجمی نے زیبا کو بلا کر اپنے پاس بٹھا لیا۔ "بٹیا' خالہ نے تجھ سے بات کی تھی نا؟"

"جی بابا۔"

"بٹیا' میری گڑیا! دیکھ کل سے انشاء اللہ تیری نئی زندگی شروع ہو رہی ہے.........."

"لیکن بابا میں تم سے دور نہیں جانا چاہتی۔"

"کوئی لڑکی بھی نہیں جانا چاہتی میری بچی' لیکن ہر بیٹی کو اپنے باپ سے دور جانا پڑتا ہے۔ کوئی بیٹی عمر بھر اپنے باپ کے پاس نہیں رہتی۔ خدانخواستہ رہے تو دونوں ہی خوش نہیں رہتے۔ بیٹیوں کو اصل خوشیاں اپنے باباؤں کی دعاؤں سے دور جا کر ہی ملتی ہیں بیٹی۔"

"لیکن بابا' نانی کہہ رہی تھیں کہ پھر میں تم سے کبھی نہیں مل سکوں گی۔"

"دیکھ بٹیا' میں نے تجھ سے کبھی کچھ نہیں کہا نا' کبھی کچھ نہیں مانگا۔"

"نہیں بابا۔"

"تو سن' تیرا بابا تجھ سے پہلی اور آخری بار کچھ مانگ رہا ہے۔ تُو بڑے گھر میں جا رہی ہے میری بچی۔ تیرا بابا بہت چھوٹا آدمی ہے' اللہ تجھے بڑا بنا رہا ہے' تُو وہاں سب کا خیال رکھنا' سب کو خوش رکھنا۔ اللہ نے چاہا تو وہاں تجھے تیرے بابا سے اچھا بابا مل جائے گا.........."

"مجھے تو بس میرا اپنا بابا چاہئے۔" زیبا رونے لگی۔

نجمی نے اسے گلے سے لگایا۔ "میری بات نہ کاٹ میری جان۔ میری بات غور سے سن اور وعدہ کر اس پر عمل کرے گی۔ اپنے شوہر کی اور دوسرے بابا کی خوب خدمت کرنا' ان کا کہا ماننا۔ دوسرے بابا کی بیٹی بالکل تجھ جیسی تھی۔ وہ تجھے اپنی بیٹی ہی سمجھیں گے۔ میرے لئے پریشان نہ ہونا' کبھی میرا ذکر نہ کرنا۔ دیکھ' تیری نانی تو میرے پاس ہوگی' میرا خیال رکھے گی۔ وہ وہاں تیرے گھر آتی رہے گی' تجھے میری خیریت معلوم ہوتی رہے گی۔ کبھی قسمت میں ہوگا تو ہم مل جائیں گے۔ میری بچی' تُو وہاں جا کر اپنے اس اندھے مجبور بابا کی لاج رکھنا' کسی کو شکایت کا موقع نہ دینا۔" وہ اس کے ہچکیوں سے لرزتے جسم کو تھپتھپاتا' اسے چمکارتا رہا۔ "اور ہاں' نانی نے تجھ سے جو کہا ہے وہ ایک پل کے لئے بھی نہ بھولنا۔ وہاں جا کے وہی کچھ کہنا جو تیرا شوہر کہے۔ کہنا' میں لاوارث ہوں۔ ماں باپ یاد نہیں۔ کوئی مجھے اس ادارے میں چھوڑ گیا تھا جہاں سے ڈاکٹر صاحب لائے ہیں۔ وہیں پلی بڑھی ہوں۔ سمجھ گئی نا بٹیا رانی؟"

زیبا اب پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھی اور ہچکیوں کے درمیان کہہ رہی تھی۔ "یہ سب بہت مشکل ہے بابا' کیسے ہوگا مجھ سے!"

نجمی نے اس کا چہرہ اوپر اٹھا کر انگلیوں سے اس کے آنسو پونچھے اور اس کی آنکھوں کو چوم لیا۔ "مشکل نہیں ہے بٹیا' ایک بیٹی کے اندھے باپ کی حیثیت سے تیرہ سال گزارنے سے زیادہ کچھ بھی مشکل نہیں میری بچی۔ جب بھی کچھ مشکل لگے' اپنے اندھے

بابا کا تصور کر لینا۔" اس نے رندھی ہوئی آواز میں کہا۔ ہچکیاں تھم گئیں۔ زیبا نے اپنے بابا کو بہت غور سے دیکھا اور نہ جانے اس کے چہرے پہ کیا دیکھا کہ اسے قرار آگیا۔

"بابا' میں تمہاری بات پوری کرنے کو ہر مشکل سے گزر جاؤں گی لیکن بابا' تم بہت یاد آؤ گے۔"

"یاد تو میں بھی تجھے بہت کروں گا میری بچی۔" نجمی نے دل میں کہا۔ پھر اس نے زیبا کا سر تھپتھپا کر کہا۔ "سب ٹھیک ہو جائے گا میری بچی۔ جا' اب سو جا۔"

☆======☆======☆

نجمی کے لئے اندھا ہونے کے باوجود وہ زندگی کی خوب صورت ترین صبح تھی۔ وہ بہت خوش تھا۔ بات بات پر چہک رہا تھا۔

"جانا نہیں ہے کیا نجمی؟" ناشتے کے بعد صغریٰ نے مذاق سے پوچھا۔

"آج کیوں جاؤں گا؟ آج تو میری بیٹی کی شادی ہے۔ اس کی پیدائش کے بعد یہ پہلی خوشی ہے جس نے میرے دروازے پر دستک دی۔ خالی ہاتھ ہونے کے باوجود بہت اچھا لگ رہا ہے مجھے۔"

صغریٰ ہنس دی۔ "تو پھر اب کیا ارادہ ہے؟"

"پہلے تو بلاوا دینے چلیں گے پھر زیبا کے لئے کپڑے' چوڑیاں اور مہندی خریدیں گے چل کر۔"

صبح ہی صبح وہ صغریٰ کے ساتھ جا کر بستی کے چند گھروں میں بلاوے دے آیا۔ لوگ اسے دیکھ کر' اس کی خوش قسمتی پر حیران تھے۔ سب نے یہ وعدہ کیا کہ وہ ضرور آئیں گے۔ گھر واپس جاتے ہوئے نجمی ہنسا۔

"کیا بات ہے؟" صغریٰ نے پوچھا۔

"سوچ رہا ہوں' آج مجھے یہ خیال ہی نہیں آیا کہ زیبا کو گھر میں اکیلا چھوڑ کر آیا ہوں۔"

"اطمینان ہو گیا ہے نا!"

گھر پر ان گھروں کی لڑکیاں بالیاں موجود تھیں' جن کے ہاں بلاوے دیئے گئے تھے۔

ایک لڑکی ڈھولک لے آئی تھی اور اب گیت گائے جا رہے تھے۔ انہیں باہر ہی سے آوازیں سنائی دے گئیں۔

"یہ اپنے گھر میں ہو رہا ہے نا خالہ؟؟"

"ہاں۔"

"واہ خالہ، میری قسمت دیکھو! میری خوشی میں سب شریک ہیں۔" اس نے خوش ہو کر کہا۔

صغریٰ کہنے والی تھی کہ دکھ میں بھی سب ہی شریک تھے مگر پھر اس نے خود کو روک لیا۔ خوشی کے موقع پر زخم کریدنا کیا معنی! گھر سے چائے کی ایک پیالی پی کر وہ صغریٰ خالہ کے ساتھ خریداری کے لئے نکل کھڑا ہوا۔ واپس آنے کے بعد اس نے جیسے تیسے کھانا کھایا۔ خوشی نے بھوک اُڑا دی تھی۔ پہلی بار اس کے گھر میں چہل پہل ہو رہی تھی۔ زندگی کا ہنگامہ تھا۔ عورتیں بھی آ گئی تھیں۔ وہ بار بار جا کر زیبا کے سر پر ہاتھ رکھتا۔ چار بجے کے بعد یہ حال ہو گیا کہ وہ ہر پانچ منٹ بعد پوچھتا۔ "کیا بجا ہے بھائی؟" پھر صغریٰ خالہ کو پکارتا۔ "خالہ......... سب انتظام مکمل ہے نا؟"

پونے چھ بجے وہ محلے کے چند آدمیوں کو ساتھ لے کر دروازے پر جا کھڑا ہوا۔

"اب کسی بھی وقت ڈاکٹر وحید آ جائیں گے اپنی گاڑی میں۔" وہ ان سے کہتا۔ سوا چھ بج گئے تو وہ تشویش میں مبتلا ہو گیا۔ دل میں طرح طرح کے وسوسے سر اٹھانے لگے۔ کہیں ڈاکٹر نے ارادہ تو نہیں بدل دیا؟ ہم تو ہیں ہی بدنصیب۔ کہیں ڈاکٹر کو کچھ ہو تو نہیں گیا؟ طبیعت تو خراب نہیں ہوگئی اس کی؟ ایکسیڈنٹ تو نہیں ہو گیا خدانخواستہ؟ اب تو وہ ڈر کے مارے وقت بھی نہیں پوچھ رہا تھا کسی سے۔ چھ بج کر بیس منٹ پر دو گاڑیاں آتی دکھائی دیں لیکن وہ بجی ہوئی نہیں تھیں۔ نجمی نے انجن کی آواز سنتے ہی کہا۔

"بارات آ گئی۔"

نہیں پڑوسی نے کہا۔ "گاڑی بجی ہوئی نہیں ہے۔"

"ڈاکٹر صاحب سادگی کے قائل ہیں۔" نجمی نے جلدی سے کہا۔

وہ گاڑیاں نجمی کے گھر کے سامنے رکیں۔ صغریٰ نے کہا۔ "بارات آ گئی۔"

جاؤ......... ہار ڈالو۔"

بارات میں سات آدمی تھے۔ وہ سب کے سب پڑھے لکھے، معقول اور خوش لباس تھے جو اس علاقے کے اعتبار سے بے حد مختلف دکھائی دے رہے تھے۔ ان میں صرف ڈاکٹر وحید سوٹ پہنے ہوئے تھا۔ اس کے سر پر جناح کیپ تھی۔ قاضی صاحب نکاح کا رجسٹر ہاتھ میں لئے الگ دکھائی دے رہے تھے۔ دروازے پر استقبال کے لئے کھڑے لوگوں نے ان کے گلے میں ہار ڈالے۔ ڈاکٹر وحید نجمی کے سامنے آ کھڑا ہوا۔ نجمی نے اس کے گلے میں سب سے بڑا ہار ڈال کر اسے لپٹا لیا۔ ذرا ہی دیر بعد نکاح ہو گیا۔ دلہا کی طرف سے چھوہارے تقسیم کئے گئے اور دلہن والوں نے سب کی شربت سے تواضع کی۔ ڈاکٹر وحید کا ایک دوست کیمرا لے کر آیا تھا، وہ تصویریں بناتا رہا۔ دلہا دلہن کی ایک دوسرے کے ساتھ بھی تصاویر بنائی گئیں۔ زیبا کے سر پر صرف ایک سرخ دوپٹا تھا جو اسے دلہن ثابت کر رہا تھا۔

آٹھ بجے کے قریب وحید کے ایک دوست نے نجمی سے کہا۔ "انکل، اب ہمیں اجازت دیں۔"

"ضرور بیٹا، سر آنکھوں پر۔"

رخصتی کے وقت زیبا کا برا حال تھا۔ اس کا پورا جسم لرز رہا تھا اور آنسو تھمتے ہی نہیں تھے، وہ اتنا روئی کہ بے ہوش ہو گئی۔

صغریٰ ڈاکٹر وحید کو الگ لے گئی۔ "ڈاکٹر صاحب، زیبا بہت گھبرا رہی ہے۔"

"فطری بات ہے۔" وحید نے کہا اور کچھ دیر سوچتا رہا پھر بولا۔ "اماں! تم ایسا کرو، تم ہمارے ساتھ چلی چلو۔ لڑکیوں کے ساتھ ایسے موقع پر کوئی رشتہ دار تو جاتا ہی ہے۔"

"اپنے تایا سے کیا کہو گے؟"

"ان سے کہوں گا، رفاہی ادارے کے قانون کے مطابق کوئی لڑکی وہاں سے شادی کے بغیر رخصت نہیں ہو سکتی۔ میرے اصرار پر انہوں نے قانون میں لچک پیدا کر لی لیکن اپنا ایک نمائندہ ساتھ بھیج دیا ہے۔"

"اے بیٹا، تم جھوٹ بہت زبردست بولتے ہو۔ مجھے تو ڈر لگنے لگا ہے تم سے۔"

صغریٰ نے ہنس کر چوٹ کی۔ وحید جھینپ کر رہ گیا۔

صغریٰ نے نجمی سے بات کی تو وہ بہت خوش ہو گیا۔ "یہ تو بہت اچھا ہے' زیبا بھلی بچی ہے۔"

"نہیں تو اکیلا رہ جائے گا۔ میرا دل یہاں اٹکا رہے گا۔"

"آپ میری فکر مت کرو خالہ' تم جاؤ۔ اب میں کمزور اور معذور نہیں رہا۔" نجمی نے خوش دلی سے کہا۔

بیٹی رخصت ہو گئی۔ محلے کے مہمان بھی اپنے گھر چلے گئے' اب وہ اکیلا تھا لیکن دماغ پر کوئی بوجھ نہیں تھا۔ وہ خود کو بہت ہلکا پھلکا محسوس کر رہا تھا۔ اس کی جیب میں چار چھوہارے پڑے تھے۔ بیٹی کے نکاح کے چھوہارے' اس نے ایک چھوہارہ نکال کر اسے چبایا۔ وہ اسے بہت زیادہ ہی میٹھا لگا۔ رخصت ہو گیا تھا' بیٹی رخصت ہو گئی تھی' اسے اپنا وعدہ یاد آیا...... شکر کا وعدہ!

"اے اللہ' تیرا شکر ہے...... اے اللہ' تیرا شکر ہے۔" وہ اسی ایک جملے کو دہراتے چلا گیا پھر اسے اچانک خیال آیا۔ "یہ میں زور زور سے کیوں بول رہا ہوں' کیا دنیا کو جتانا ہے؟"

اب وہ خاموش تھا لیکن اس کی زبان اسی ایک جملے کے لئے حرکت کر رہی تھی۔ اسے ایسا لگا کہ اس کی دھڑکنیں' اس کی سانسیں بھی اس جملے سے ہم آہنگ ہو گئی ہیں' پھر چنبیلی کی بیل' موتیا' گلاب اور رات کی رانی کے پودے بھی اس لے پر جھومنے لگے اور اس کی جھونک میں پوری کائنات اس کے ساتھ مل کر کہنے لگی۔ اے اللہ' تیرا شکر ہے۔ رات گزر گئی اور اسے پتا بھی نہ چلا۔ وہ زیر لب اسی جملے کو دہراتا رہا۔ اے اللہ تیرا شکر ہے۔ فجر کی اذان نے اسے چونکا دیا۔ شکر کی پہلی رات گزر گئی تھی۔

صبح اس کا کام پر جانے کو جی ہی نہیں چاہا۔ اس نے ہاتھ منہ دھویا۔ ناشتا تھا ہی نہیں' خواہش بھی نہیں تھی۔ وہ کیاری کی طرف چلا گیا۔ چنبیلی کی بیل بے تکی پھیل رہی تھی۔ اس نے اس کی چھٹائی شروع کر دی۔ اس تمام وقت وہ زیر لب اے اللہ تیرا شکر ہے' کہتا رہا تھا۔ کام کے دوران کبھی کبھی وہ اس احساس سے چونکتا کہ اس کی زبان رک

گئی ہے۔ وہ شکر ادا نہیں کر رہا ہے۔ یوں شکر کا سلسلہ پھر جاری ہو جاتا۔

صغریٰ آئی۔ وہ بہت خوش تھی۔ "بہت بہت مبارک ہو نجمی بیٹے تجھے!" اس نے [illegible] کہا۔

"تمہیں بھی مبارک ہو خالہ' کیسی گزری؟"

"بہت اچھے لوگ ہیں بیٹا' بڑے صاحب تو بہت ہی اچھے ہیں۔ زیبا کو دیکھتے ہی گلے لگ گیا اور رونے لگے۔ دیر تک روتے رہے پھر ڈاکٹر صاحب کو [illegible] شکر کر کے کیوں نہیں لائے ہو اسے! کہنے لگے' پوری [illegible] تمہیں [illegible] ہوں گی۔ [illegible] سب پڑوسیوں کی ضیافت کا انتظام کیا پھر زیبا کو ساتھ لے کر گئے۔ سرال کا جوڑا بہت [illegible] زیبا کو [illegible] کیا اور خوب دعائیں دیں۔ بڑے صاحب [illegible] تو نے مجھ گناہ گار پر کتنا بڑا احسان کیا ہے۔ [illegible] کوئی [illegible] عمر بھر اسے سنبھال کر رکھوں گا [illegible] سے لگائے......"

نجمی کی آنکھیں چھلک گئیں۔ اے اللہ تیرا شکر ہے' اے اللہ...... "زیبا خوش ہے نا؟" اس نے پوچھا۔

"بہت خوش ہے' بہت ہی خوش۔"

نجمی نے آنکھوں سے بہہ آنے والے خوشی کے آنسوؤں [illegible] سے پونچھا۔ اے اللہ تیرا شکر ہے۔ اے اللہ...... "بس خالہ اب مجھے [illegible] نہیں رہا۔ کوئی پریشانی نہیں۔"

"ارے تو تو صبح سے بھوکا بیٹھا ہو گا۔" صغریٰ کو اچانک خیال آیا۔

نجمی نے ایک گہری سانس لی۔ اے اللہ تیرا شکر ہے' اے اللہ...... "مجھے بھوک ہی نہیں تھی خالہ۔"

"ابھی کھانا پکاتی ہوں۔"

ظہر کی اذان ہوئی تو نجمی کے قدم خود بخود غسل خانے کی طرف اٹھ گئے۔ وضو کے دوران وہ حیرت سے سوچتا رہا۔ کہتے ہیں کہ آدمی پریشانی میں' دکھ میں' تکلیف میں اپنے

رب کی طرف جاتا ہے اور جب اس کا مطلب نکل جاتا ہے تو پھر بدل جاتا ہے لیکن اسے تو دکھوں میں کبھی نماز کا خیال ہی نہیں آیا تھا۔ اب دکھ چھٹے ہیں تو پہلی بار نماز کی سُوجھی۔ اس دن کے بعد اس کی کوئی نماز قضا نہیں ہوئی۔

☆======☆======☆

زیبا کی شادی کو پندرہ دن ہو چکے تھے۔ زندگی پھر اپنے معمولات کی طرف لوٹ آئی تھی لیکن کچھ فرق کے ساتھ۔ اب صرف صغریٰ تھی جو نجمی کو اس کے سامان سمیت اس کی بے چھت اور بے در و دیوار دکان پر چھوڑ کر جاتی تھی اور لینے آتی تھی۔ ایک فرق یہ بھی تھا کہ وہ خوش مزاج ہو گیا تھا۔ کوئی کچھ پوچھتا تو وہ اسے نرمی سے، محبت سے جواب دیتا۔ اس کی آدم بے زاری ختم ہو گئی تھی۔ خود سے البتہ وہ کسی سے بات کم ہی کرتا تھا۔ اس کی زبان تو اے اللہ تیرا شکر ہے کے ورد میں مصروف رہتی تھی۔ کبھی کبھی اسے خیال آتا کہ اس کی زبان ٹھہر گئی ہے، شکر کا سلسلہ موقوف ہو گیا ہے۔ ایسے میں وہ دل ہی دل میں گڑگڑا کر کہتا۔ "اے اللہ میں ناشکرا بہت شرمندہ ہوں، بار بار بھول جاتا ہوں۔" وہ پھر شکر ادا کرنا شروع کر دیتا۔ اب تو وہ کسی سے بات کرتے ہوئے بھی دل ہی دل میں شکر ادا کرتا۔

ایک روز قریب ہی ایک گاڑی آ کر رکی۔ لاؤڈ سپیکر پر ایک آواز گونجی، انعام کا انعام ثواب کا ثواب، بلائنڈز ویلفیئر سوسائٹی ریفل کا ٹکٹ خریدیئے، صرف دس روپے میں۔ آپ کی دی ہوئی یہ رقم آنکھوں سے محروم لوگوں کی بھلائی کے کام آئے گی، ثواب دلائے گی اور یہ بھی ممکن ہے کہ آپ کا انعام نکل آئے۔ پہلا انعام دس لاکھ روپے نقد، دوسرا انعام.........

نجمی اپنی جگہ سے اٹھا اور آواز کی سمت چل دیا۔ گاڑی کے قریب پہنچ کر اس نے کہا۔ "اے بھائی، تمہاری سوسائٹی اندھوں کی کس طرح مدد کرتی ہے؟"

"ہم انہیں لکھنا پڑھنا سکھاتے ہیں۔ ہنر سکھاتے ہیں تاکہ وہ اپنے پیروں پہ کھڑے ہو کر معاشرے کے لئے کار آمد بنیں، بھکاریوں کے روپ میں بوجھ نہ بنیں۔ ہم انہیں ایک خوشگوار ماحول دیتے ہیں انہیں.........."

"ایک ٹکٹ دے دو مجھے۔"

نجمی نے وہ ٹکٹ لے کر بنیان کی، گھر کے خرچ والی جیب میں ڈال لیا۔ اس نے قرعہ اندازی کی تاریخ بھی غور سے نہیں سنی۔ اسے انعام کی طلب تھی بھی نہیں۔ وہ تو ایک کارِ خیر میں حصہ لے رہا تھا۔ زندگی مدھم سُروں میں گنگناتی ہوئی چلتی رہی۔ نجمی کی زبان، سانسیں اور دھڑکنیں اللہ کا شکر ادا کرتی رہیں۔

ایک روز وہ انگلی سے بندھی گیند اچھال رہا تھا کہ کسی نے اس سے پوچھا۔ "بابا تم پھر گیندیں بیچنے لگے؟" آواز کسی نوجوان کی تھی۔

"ہاں بیٹا، اللہ کا شکر ہے۔" نجمی نے جواب دیا۔ اسے احساس ہو گیا کہ نوجوان اس کے بھیک مانگنے والے عرصے کا حوالہ دے رہا ہے۔

"بابا، تیرہ چودہ سال پہلے میں بھی بچہ تھا اور تم سے ہر روز ایک گیند خریدا کرتا تھا۔" نوجوان نے کہا۔ "اور جب تم نے گیندیں بیچنا چھوڑ دیا تھا تو میں بہت رویا تھا۔" اس نے یہ نہیں بتایا کہ بعد میں وہ گیند کی اٹھنی ہر روز چپکے سے اس کی چادر پر ڈال جاتا تھا۔

"ہاں بیٹا، مجبوری نے میرے پیروں کی جان نکال لی تھی۔ مجھے بہکا دیا تھا، بھٹکا دیا تھا۔ پھر اللہ نے مجھے راہ دکھائی، مجھے سہارا دیا، میری ٹانگوں کو قوت دی کہ میں اپنے پیروں پہ کھڑا ہو سکوں۔ شکر ہے میرے مالک کا۔"

"اور بابا تمہاری ایک بیٹی بھی تو ہوتی تھی!"

"ہاں بیٹا، اللہ کا شکر ہے اس کی شادی ہو گئی۔"

"تمہارا نام کیا ہے بابا؟"

"نجم الحسن۔ سب جاننے والے نجمی بابا کہتے ہیں مجھے۔"

"نجمی بابا، مجھے یہاں سے گئے نو سال ہو چکے ہیں لیکن میں تمہیں کبھی نہیں بھولا اور شاید مرتے دم تک نہیں بھول پاؤں گا۔ اچھا بابا، مجھے ایک گیند دے دو لیکن پیسے نہیں ہیں میرے پاس۔"

"ارے کوئی بات نہیں ہے بیٹا، یہ لو۔" نجمی نے ایک واٹر بال اس کی طرف بڑھا دیا۔ "اور بیٹا تم نے اپنا نام نہیں بتایا۔ اب کہاں رہتے ہو تم؟"

نوجوان والنٹیئر نے بابا کے پیر چھوئے اور چلا گیا۔ جاتے جاتے دل ہی دل میں کہہ رہا تھا مجی بابا... آج تمہارا حساب برابر ہو گیا' اب صرف میں مقروض ہوں۔ میرا نام امجد ہے بابا اور گلشن اقبال میں رہتا ہوں۔ اچھا اب چلتا ہوں بابا جی خدا حافظ۔"

"فی امان اللہ' خدا تمہیں ہمیشہ خوش رکھے۔"

چند روز بعد اس کے ٹھکانے کے پاس ایک گاڑی آ کر رکی' دروازہ کھلا' کوئی اترا اور اس کی طرف بڑھا۔ "تم ہی نجم الحسن ہو .... نجمی بابا؟" اس نے پوچھ لیا۔

نجمی نے ایک لمحے پریشان ہوا پھر اس نے خود کو سنبھال لیا۔ "ہاں میں ہی نجم الحسن ہوں' کیوں؟"

"میں تمہیں لینے آیا ہوں۔"

"کہاں لے جاؤ گے مجھے؟"

"اسپتال۔ میں لائنز کلب سے آیا ہوں' تمہیں لے جانے کے لئے۔"

"لیکن کیوں؟"

"وہاں تمہارے آنکھیں لگیں گی' پہلے ڈاکٹر یہ چیک کریں گے کہ تمہارے آنکھیں لگ بھی سکتی ہیں یا نہیں۔ ٹسٹ کامیاب ہو گیا تو آپریشن ہو گا اور اس کے بعد انشاء اللہ تم دیکھ سکو گے۔"

"دیکھ سکوں گا!" نجمی حیران رہ گیا۔ ایک لمحے کو تو وہ شکر ادا کرنا بھی بھول گیا۔ "مگر میرے پاس اتنا پیسہ کہاں کہ آنکھ خرید سکوں؟" اس نے کہا۔

"کسی نے اپنی آنکھوں کا عطیہ خاص طور پر تمہیں دیا ہے' اسی لئے میں تمہیں ڈھونڈتا ہوا یہاں آیا ہوں۔"

"کس نے دیا مجھے آنکھوں کا عطیہ؟"

"اب یہی سب پوچھتے رہو گے یا چلو گے بھی؟"

"چلتا ہوں لیکن گھر پر تو بتا دوں۔"

☆------☆------☆

نجمی اسپتال سے نکلا تو دیکھ سکتا تھا۔ اس کا پورا وجود خدا کا شکر ادا کر رہا تھا۔ جسم کا رواں رواں سجدہ ریز تھا۔ ٹسٹ کامیاب ہوا تھا پھر آپریشن کامیاب ہوا۔ اس کی بینائی لوٹ آئی۔ اس نے ڈاکٹر سے کہا۔ "خدا کے لئے........ اب تو مجھے میرے محسن کا نام بتا دو۔"

"اس کی آخری خواہش تھی کہ اس کی آنکھیں تمہارے لگا دی جائیں لیکن تمہیں اس کے متعلق کچھ نہ بتایا جائے۔"

"لیکن ڈاکٹر' میرا خیال ہے آپ لوگ آنکھ کا عطیہ غیر مشروط لیتے ہیں' کوئی فرمائش تو پوری نہیں کرتے کسی کی؟"

"ایسا بھی ہوتا ہے لیکن یہ جس شخص کا معاملہ ہے وہ ہمارے لئے رضا کارانہ طور پر کام کرتا تھا۔ اس نے آنکھوں کے عطیے کے سو سے زیادہ فارم پُر کروا کے ہمیں دیئے تھے۔ اس کا ایکسیڈنٹ ہوا تو اس نے ہمیں بلوایا اور تمہارے متعلق بتا کر کہا' اس کی آنکھیں تمہیں لگا دی جائیں۔ اس کی خواہش کا احترام ہم پر فرض تھا۔"

"خدا کے لئے ڈاکٹر اس کا نام نہیں بتا سکتے تو مجھے اس کے متعلق کچھ بتاؤ۔"

"بس تمہیں اتنا بتا سکتا ہوں کہ اس نے کیا کہا تھا۔ اس نے کہا تھا' نجمی بابا سے کہنا کہ اپنی گناہ گار آنکھیں انہیں دے رہا ہوں کہ شاید اسی طرح پاک ہو جائیں۔ ان سے کہنا' مجھے معاف کر دیں اور میری مغفرت کے لئے دعا کرتے رہیں۔"

اس کے اصرار کے باوجود ڈاکٹر نے اس سے زیادہ کچھ نہیں بتایا تھا۔ نجمی کو یقین تھا کہ یہ وہی لڑکا امجد ہے جس نے چند روز پہلے اس سے باتیں کی تھیں اور والنٹیئر بھی تھا۔ جو تیرہ سال پہلے اس سے گیند خریدتا تھا۔ جو نو سال پہلے گلشن اقبال چلا گیا تھا لیکن

گناہ گار آنکھوں والی بات اور معاف کر دینے والی بات اس کی سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔ یہ الجھن دور نہ ہوئی تو اس نے اپنے ان دیکھے' ان جانے محسن کی خواہش پوری کرنے کے لئے زیرلب کہا۔ "اے اللہ' میں تجھ کو گواہ بنا کر کہتا ہوں کہ میں نے اس شخص کی جس نے مجھے آنکھیں دی ہیں' ہر خطا معاف کی۔ اپنی رحمت سے اسے جنت الفردوس میں جگہ عطا فرما۔"

اسپتال سے نکل کر اس کا جی چاہا کہ پوری دنیا دیکھے۔ دنیا نہ سہی' اپنا شہر دیکھے۔ پھر اس نے سوچا پہلے گھر جانا چاہئے۔ وہ چوک پر بس سے اترا' سب کچھ اسے بہت عجیب سا لگ رہا تھا۔ سب کچھ جانا پہچانا لیکن اجنبی اجنبی سا۔ اسے لگ رہا تھا کہ اس کی یادداشت تیرہ چودہ سال بعد واپس آئی ہے۔ اس نے پان کی دکان کو بہت غور سے دیکھا' دکان کا مالک بہت بدل گیا تھا۔ اس نے اس پیڑ کو دیکھا جس کے سائے میں اس نے بھیک بھی کمائی تھی اور روزی بھی۔ اس نے اس دیوار کو دیکھا جس کے ساتھ وہ چادر بچھاتا تھا۔ اس کے تصور میں اس چادر پر بیٹھا ہوا وہ خود اور اس کی ننھی زیبا آ گئی۔ اس کے دل میں ہوک سی اٹھی۔ زیبا جوان ہو چکی ہے' اس کی شادی ہو چکی ہے' اب تو میں اسے دیکھوں تو پہچان بھی نہیں سکوں گا۔ وہ تیزی سے جانے پہچانے راستے پر چل دیا' گھر کی طرف۔ اس کی آنکھیں شکر کے آنسو بہا رہی تھیں۔ اس کی سانسوں اور دھڑکنوں میں ایک ہی آواز تھی' اے اللہ تیرا شکر ہے۔ اے اللہ..........

ایک بوڑھی پھونس عورت دروازے پر کھڑی تھی۔ جانی پہچانی سی صورت۔ عورت اسے دیکھتے ہی لپکی۔ "ارے' یہ تو صغریٰ خالہ ہے' اتنی بڈھی ہو گئی!" اس نے سوچا۔

"نجمی! آ گیا تو۔ ارے رو کیوں رہا ہے' کیا خدانخواستہ.........؟"

"نہیں خالہ' میں تمہیں دیکھ سکتا ہوں۔ میں سب کچھ دیکھ سکتا ہوں' اللہ کا شکر ہے۔" اس نے ہچکیوں کے درمیان کہا۔

"تو رو کیوں رہا ہے پگلے' تُو نے تو مجھے ڈرا ہی دیا تھا۔"

اس نے صغریٰ کا چہرہ دونوں ہاتھوں میں بھر لیا۔ "یہ تو شکر کے' خوشی کے آنسو ہیں خالہ' ہلومت میں تمہیں جی بھر کر دیکھوں گا۔"

"ارے پگلے' اندر چل میں تو تجھے ایسی چیز دکھاؤں گی کہ خوش ہو جائے گا تو۔ چل میرے ساتھ۔"

صغریٰ اسے گھر میں لے گئی۔ "بیٹھ' میں وہ چیز لاتی ہوں۔"

وہ چارپائی پر بیٹھ کر چنبیلی کی بیل اور ان پودوں کو تکنے لگا جو قمرن نے لگائے تھے۔

صغریٰ واپس آئی تو اس کے ہاتھ میں ایک البم تھی۔

"یہ زیبا کی شادی کی' یہاں کی اور وہاں کی اور شادی کے بعد کی تصویریں ہیں۔ ڈاکٹر صاحب یہ البم لائے تھے۔ میں نے تجھ سے ذکر نہیں کیا تھا کہ تجھے آنکھوں کی محرومی کا احساس ہو گا۔ پوری بستی دیکھ چکی ہے یہ تصویریں' سب بہت خوش ہوئے تھے۔ آج خدا نے یہ دن بھی دکھایا کہ تُو دیکھ سکتا ہے۔ لاکھ لاکھ شکر ہے پروردگار کا۔"

نجمی نے البم کی پہلی تصویر دیکھی۔ تر و تازہ' شاداب نوخیز قمرن اس کے روبرو تھی لیکن اس نے قمرن کا یہ روپ کبھی نہیں دیکھا تھا۔ "ارے دیوانے!" اس نے خود سے کہا۔ "یہ تو زیبا ہے۔" اس نے البم چارپائی پر رکھی اور صغریٰ کے قدموں میں بیٹھ کر اس کی گود میں سر رکھ دیا۔ "تم بہت اچھی ہو ماں.......... بہت اچھی۔"

"تُو تصویریں تو دیکھ لے۔" صغریٰ نے رندھی ہوئی آواز میں کہا۔

"دیکھ لوں گا ماں' دیکھتا ہی رہوں گا انشاء اللہ۔ پہلے اپنی جنت تو کما لوں۔" اس نے جواب دیا۔ اس کی سانسیں گنگنا رہی تھیں' اے اللہ' تیرا شکر ہے' اے اللہ..........

☆======☆======☆

زندگی اب بہتے پانی کی طرح نہیں تھی۔ وہ سمندر کا روپ دھار گئی تھی۔ ٹھہراؤ ہی ٹھہراؤ۔ ظرف ہی ظرف' شکر ہی شکر۔ نجمی کو آنکھیں ملے دو تین دن ہو گئے تھے۔ پہلے روز صغریٰ نے اس سے کہا تھا کہ زیبا سے ملنے' اسے دیکھنے چلے لیکن اس نے منع کر دیا تھا۔ اس نے ڈاکٹر وحید سے وعدہ جو کیا تھا۔ "میں یونہی بہت خوش ہوں ماں۔ تم مجھے بتاتی رہو کہ وہ خوش ہے۔ مجھے اس سے زیادہ کچھ نہیں چاہئے۔"

یہ ایک تبدیلی آئی تھی۔ اب وہ صغریٰ خالہ کے بجائے ماں کہنے لگا تھا۔ اس نے صغریٰ سے کہہ دیا تھا کہ اب اسے کام پر جانے کی کوئی ضرورت نہیں۔ صغریٰ نے اسے

سمجھانے کی بہت کوشش کی تھی مگر پھر تھک ہار کر ہتھیار ڈال دیئے تھے۔ نابینا سے بینا بننے والی تبدیلی کوئی معمولی تبدیلی نہیں تھی۔ وہ اندر سے بدل کر رہ گیا تھا۔ بے نام خدشے، وسوسے، خوف اب کچھ بھی نہیں تھا۔ ایک گہری طمانیت تھی جس نے اسے اندر سے روشن کر دیا تھا۔

لیکن وہ لمحہ بہت عجیب تھا جب اس نے پہلی بار آئینہ دیکھا۔ اس کا دل دھک سے رہ گیا، الجھے ہوئے، چکٹے ہوئے سفید بال، جھریوں سے بھرا ہوا چہرہ، اندر دھنسے ہوئے رخسار اور جھلسی ہوئی رنگت۔ اس چہرے پر وہ شفاف، روشن اور خوب صورت آنکھیں بے حد اجنبی لگ رہی تھیں۔ "یہ میں ہوں؟" وہ بڑبڑایا تھا۔ "نہیں ہرگز نہیں! میں کہاں گیا؟ کہاں چلا گیا میں؟ آئینے میں دیکھتا ہوں، میں کہاں چلا گیا؟" اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنا چہرہ ڈھانپ لیا۔

اسی لمحے اس کے اندر کسی نے پھنکار کر کہا۔ "کم ظرف، ناشکرے، جب تک کچھ دیکھنا نصیب نہیں تھا تو دیکھنے کو ترستا تھا۔ ناممکن ممکن ہو گیا، دیکھنے والی آنکھیں مل گئیں تو آپے سے باہر ہو رہا ہے!" وہ پوری جان سے لرز کر رہ گیا۔ معبود! معاف کر دے مجھے۔ وہ بڑبڑایا، شرم سار ہوں۔ بہت بڑا ناشکرا پن سرزد ہوا ہے مجھ سے۔ اس نے پھر آئینے میں خود کو دیکھا۔ "ٹھیک تو ہے۔" اس نے خود سے کہا۔ "خود اپنا حلیہ بگاڑ رکھا ہے۔ پہلے بال بنواتا، نہاتا اور صاف ستھرے کپڑے پہننا چاہیے تھا پھر خود سے ملنا چاہیے تھا مجھے، اور یہ بھی ذہن میں رکھنا چاہیے تھا کہ میں خود کو تقریباً چودہ سال کے بعد دیکھ رہا ہوں۔"

اس نے بال کٹوائے، شیو بنوایا، دھلے ہوئے کپڑے پہنے پھر آئینے کے روبرو گیا۔ ایک باوقار، بردبار شخص اس کے سامنے تھا۔ ہاں، یہ میں ہوں۔ اس کے اندر سے آواز آئی۔ اے اللہ، تیرا شکر ہے اے اللہ.........

اگلے روز اس نے اپنی گیندوں کی بالٹی اٹھائی اور صغریٰ کو خدا حافظ کہہ کر گھر سے نکلا۔ اس روز اسے احساس ہوا کہ واٹربال بیچنا صرف روزگار ہی نہیں ایک دلچسپ کھیل بھی ہے۔ وہ دنیا دیکھ رہا تھا۔ اب تیسرا دن تھا۔ معمول پھر بن چکا تھا مگر اب وہ صرف گیندیں اچھالتا رہتا تھا۔ صدا نہیں لگاتا تھا۔ صدا لگاتا تو گیا، حتی الامکان وہ بولنے سے بھی

[illegible] تحفہ [illegible] پہنچتا تھا [illegible] اللہ [illegible] شاید اس نے [illegible] قیمت [illegible] اپنی [illegible] تھے۔ [illegible] اسے اللہ تیرا شکر [illegible] کی آواز سنائی دیتی [illegible] تھی۔

راستہ کٹتا [illegible] کے بعد [illegible] زندگی [illegible] نہیں ہو [illegible] اور [illegible] ایک تقدس آمیز خوشی [illegible] اور وہ کہتا اے اللہ تیرا شکر ہے۔ بعض اوقات تو اس کیفیت میں گریہ ہو جاتی۔ وہ سوچتا تو [illegible] جملے کا ورد [illegible] ہوا اور [illegible] حقیقت تو یہی اس کی زبان پر یہی جملہ ہوتا۔ ہر روز وہ سوچتا آنکھیں ملے چوتھا دن ہے، آج پانچواں دن ہے پھر وہ گنتی بھول گیا۔ بینائی بھی معمولات میں شامل ہو گئی تھی۔

اب اخبار بھی اس کے معمولات میں شامل ہو گیا تھا۔ اخبار والا روز اخبار ڈال جاتا۔ وہ ناشتے سے پہلے اٹھ کر اخبار چاٹتا رہتا۔ اخبار کو وہ ترسا ہوا تھا۔ اس روز وہ اخبار کا پچھلا صفحہ دیکھ کر چونکا۔ بلائنڈ ویلفیئر سوسائٹی ریفل کی قرعہ اندازی کا نتیجہ شائع ہوا تھا۔ اسے یاد آیا کہ اس نے بھی ایک ٹکٹ خریدا تھا۔ اس نے بنیان کی جیب سے ٹکٹ نکالا اور اخبار پر رکھ لیا۔ اس نے چھوٹے انعام والے نمبروں کی فہرست میں اپنے ٹکٹ کا نمبر دیکھنا شروع کیا جو خاصی طویل تھی۔ فہرست ختم ہو گئی۔ وہ مسکرایا۔ ثواب کا ثواب انعام کا انعام......... اس نے ٹکٹ کو پھاڑنے کا ارادہ کیا ہی تھا کہ سب سے اوپر موٹے ہندسوں میں چھپے نمبر دیکھ کر اسے لگا کہ اس کے ہندسے اس کے ٹکٹ کے نمبر سے مل رہے ہیں۔ اس نے ایک ایک کر کے ہندسے ملائے اور کئی بار ملائے لیکن نتیجہ ہر بار ایک ہی تھا۔ وہ بار بار اپنی آنکھیں ملتا اور نمبر ملاتا رہا۔ اسے اپنی آنکھوں پر یقین ہی نہیں آ رہا تھا۔ اس کے ٹکٹ کو پہلا انعام ملا تھا۔ دس لاکھ روپے!

دس لاکھ! اس نے سوچا، دس لاکھ تو بہت ہوتا ہے۔ اے اللہ، تیرا شکر ہے اے اللہ......... اس نے صغریٰ کو بھی کچھ نہیں بتایا۔ ناشتے کے بعد وہ دھندے پر جانے کے بجائے شناختی کارڈ جیب میں ڈال کر بلائنڈ ویلفیئر سوسائٹی کے دفتر چلا گیا۔

"آپ کے ریفل کی قرعہ اندازی میں میرا انعام نکلا ہے، پہلا۔" اس نے کلرک کو

بتایا۔

کلرک نے غور سے دیکھا۔ "مبارک ہو آپ کو۔" اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"اپنا شناختی کارڈ لائے ہیں آپ؟"

"جی ہاں۔" نجمی نے جیب میں ہاتھ ڈالا۔

"شناختی کارڈ کی اور انعامی ٹکٹ کی فوٹو سٹیٹ بنوا کر لے آئیں۔"

نجمی باہر جا کر مطلوبہ فوٹو سٹیٹ بنوا لایا۔ کلرک نے دراز سے ایک فارم نکال کر اس کی طرف بڑھایا۔ "یہ فارم پُر کر دیجئے اور انعامی ٹکٹ اور شناختی کارڈ اس کے ساتھ منسلک کر دیں۔ فوٹو اسٹیٹ اپنے پاس رکھیں اور فارم مجھے دے جائیں۔"

"دے جاؤں!"

"جی ہاں۔ تقسیم انعامات کی بہت بڑی تقریب ہو گی۔ وزیر صحت بھی آئیں گے اس میں آپ۔ آپ کو اس تقریب میں شرکت کا دعوت نامہ بھیج دیا جائے گا پھر تقریب میں آپ کو انعامی رقم کا چیک ملے گا۔"

نجمی فارم پُر کرنے میں مصروف ہو گیا۔ اے اللہ' تیرا شکر ہے اے اللہ.........

تقریب ایک ماہ بعد ہوئی۔ وزیر صحت کے ہاتھوں سے اسے چیک ملا۔ فلم بھی بنی' تصویریں کھنچیں۔ اخباری نمائندے بھی اس کے پیچھے پڑے رہے۔ وہ ریفل کے لئے زبردست پبلسٹی کا سبب بن گیا تھا۔ کتنی غیر معمولی بات تھی کہ جب اس نے ٹکٹ خریدا' وہ اندھا تھا اور جب اس نے انعام وصول کیا تو وہ دیکھ سکتا تھا۔ واپس آ کر اس نے صغریٰ کو بتایا۔

"اللہ کا شکر ہے' اب تُو بڑا آدمی بن گیا۔" صغریٰ نے بے حد سچے لہجے میں کہا۔

"کیسے ماں' بڑا آدمی کیسے بن گیا میں؟"

"دس لاکھ روپے کم نہیں ہوتے۔"

"ہاں ماں' کم نہیں ہوتے لیکن آدمی کو بڑا نہیں بنا سکتے۔"

اس رات وہ سوچتا اور شکر ادا کرتا' شکر ادا کرتا اور سوچتا رہا۔ اب اسے کام کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ اللہ نے اسے بے نیاز کر دیا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اب کیا کرے

گا۔ زیبا کی شادی کے وقت اس نے سوچا تھا' میں بیٹی کے لئے کچھ بھی نہ کر سکا' کبھی اللہ نے موقع دیا تو کروں گا۔ اب اللہ نے موقع دے دیا تھا' وہ بہت کچھ کر سکتا تھا......... بس بیٹی کو بیٹی نہیں کہہ سکتا تھا۔ اس سے مل نہیں سکتا تھا' اسے دیکھ نہیں سکتا تھا۔ اس نے زیبا اور وحید کے سلسلے میں فیصلہ کر لیا۔ اس نے حساب لگایا' زیبا کی شادی کو ڈھائی مہینے ہوئے تھے اور اس کے ایکسیڈنٹ کو تقریباً پونے تین مہینے۔ صرف ڈھائی مہینے! وہ حیران رہ گیا۔ وہ تقریباً چودہ سال پہلے اندھا ہوا تھا۔ چودہ سال پہلے اس کی قسمت بگڑی تھی۔ چودہ سال کی بگڑی ڈھائی مہینے میں بن گئی تھی۔ واہ میرے مالک! تیری شان کریمی! اتنے کم وقت میں کتنا کچھ دے دیا تو نے کہ خواب سا لگتا ہے۔ بیٹی کے لئے اچھا رشتہ اور خوشیوں بھری زندگی۔ پھر کھوئی ہوئی بینائی کی واپسی اور اب اپنے بھکاری کو لکھ پتی بنا دیا۔ واقعی مالک' تیرے کرم کی کوئی حد نہیں تو تو لمحوں میں کایا پلٹ کر دے۔ اے اللہ' تیرا شکر ہے۔ اے اللہ......... اس نے یہ فیصلہ بھی کر لیا کہ وہ کیا کام کرے گا۔ اے اللہ' تیرا شکر ہے اے اللہ.........

☆======☆======☆

صبح ناشتہ کے بعد صغریٰ نے کہا۔ "اب تو کیا کرے گا نجمی؟"

"کام پر جاؤں گا ماں۔"

"اب تجھے کام پر جانے کی کیا ضرورت ہے؟"

"اب گینڈیں نہیں بیچوں گا ماں۔"

"ہاں' کوئی بڑا کاروبار کر لے۔"

"ہاں ماں' بڑا کاروبار ہی کروں گا انشاء اللہ مگر کل سے۔ آج اس کی تیاری کرنی ہے'

کچھ پیسے ہوں گے ماں؟"

"کتنے چاہئیں؟"

"کتنے ہیں؟"

"چار سو سے کچھ اوپر ہیں۔ مزید انتظام بھی ہو سکتا ہے' پر تجھے کیا کرنا ہے؟"

"نئے کپڑے خریدنے ہیں اچھے سے اور چار دن گھر کا خرچ چل جائے بس۔"

"مذاق کر رہا ہے مجھ سے۔ تیرے پاس تو بہت ہے بیٹا۔"

"ہاں ماں' بہت ہے۔ شکر ہے مالک کا لیکن آج چیک جمع کراؤں گا تو کلیئر ہونے میں بھی چار چھ دن لگیں گے۔"

"تو کوئی فکر نہ کر۔ کپڑے تو آج لے آنا' دو گھنٹے میں پیسے مل جائیں گے تجھے۔ کاروبار تو کل ہی سے شروع ہو گا نا!"

"ہاں ماں۔" وہ مسکرا دیا۔

اس نے چوک جا کر بینک میں پانچ روپے سے اکاؤنٹ کھولا اور پھر انعامی رقم کا چیک جمع کرایا۔ یہ وہی بینک تھا جہاں وہ نوٹ بدلوانے کے نام پر لٹا تھا۔ آج وہ یہاں دس لاکھ روپے جمع کرانے آیا تھا۔ اے اللہ' تیرا شکر ہے اے اللہ.........

اگلی صبح اس نے نہا دھو کر نئے کپڑے پہنے اور چادر اٹھالی۔ "یہ ... یہ چادر لے کر کہاں چلا؟" صغریٰ نے اسے ٹوکا۔

"نیا کاروبار کرنے جا رہا ہوں ماں۔"

"یہ چادر لے کر؟"

"ہاں ماں' یہ ضروری ہے۔"

"تو نئی چادر خرید لی ہوتی۔"

"نہیں ماں' یہی چادر ضروری ہے۔"

"عجیب بات ہے۔"

"میں شام کو واپس آؤں گا ماں۔"

اس نے اسی پیڑ کے نیچے چادر بچھائی جہاں اس نے چودہ سال گزارے تھے۔ وہاں بیٹھ کر وہ اپنے نئے کام میں مصروف ہو گیا۔ اے اللہ' تیرا شکر ہے اے اللہ......... اس کاروبار کے لئے یہیں بیٹھنا ضروری تھا' جہاں اسے بن مانگے بھیک ملتی رہتی تھی۔ اس کاروبار کے لئے بہت اچھے' صاف ستھرے کپڑے بھی پہننا ضروری تھا ورنہ لوگ اسے بھکاری سمجھ کر بھیک دینا شروع کر دیتے۔ اب ایسا ہونے کا امکان کم ہی تھا' ہوتا تو وہ لوٹا دیتا۔ چار چھ دن میں سب جان لیتے کہ وہ بھکاری نہیں ہے۔

وہ اللہ کی چاکری کر رہا تھا۔ موسم کیسا ہی ہوتا' وہ صبح نو بجے پیڑ کے نیچے چادر بچھا کر بیٹھ جاتا اور شام پانچ بجے اٹھ جاتا۔ اے اللہ' تیرا شکر ہے اے اللہ......... وہ وہاں بیٹھا اللہ کا شکر ادا کرتا رہتا رہتا۔ ابتدا میں اسے کچھ لوگوں کو ٹوکنا پڑا۔ جو رک کر جیبوں میں ہاتھ ڈال رہے تھے۔ تین چار دن کے بعد سب عادی ہو گئے۔ سب نے اسے شاید ایک پیر ہی کی حیثیت سے قبول کر لیا۔ ایک ہفتے کے بعد وہ بینک گیا' منیجر نے اسے بتایا کہ اس کا چیک کلیئر ہو گیا ہے۔ اسے چیک بک بھی مل گئی۔

اس روز اس نے اللہ میاں سے آدھے دن کی چھٹی لی' اس نے ڈاکٹر وحید کے نام پانچ لاکھ کا ایک چیک لکھ کر کراس کیا اور اسے جیب میں ڈال کر اسپتال کی طرف چل دیا۔ اسپتال سے پتا چلا کہ ڈاکٹر وحید چھٹی پر ہیں۔ اس نے ڈاکٹر کے گھر کا ایڈریس لیا اور ناظم آباد جانے والی بس میں بیٹھ گیا۔

ڈاکٹر وحید کا بنگلا ویسا ہی تھا جیسا کہ صغریٰ نے بیان کیا تھا۔ گیٹ پر چوکی دار موجود تھا۔ اس نے چوکی دار سے وحید کے متعلق پوچھا۔

"چھوٹے صاب تو بیگم صاب کے ساتھ کہیں گئے ہیں۔" چوکیدار نے بتایا۔

"بیگم صاحب؟" اس کا دل دھڑکنے لگا۔

"ہاں ان کی بیوی' بابا........."

چیک کراس تھا اس لئے ڈر کی کوئی بات نہیں تھی۔ اس نے جیب سے کاغذ بال پین نکالا اور مختصر سا رقعہ لکھا۔

وحید بیٹے!

صرف تم سے ملنے اور کچھ دینے آیا تھا۔ زیبا سے ملنے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ اپنا وعدہ آخری سانس تک نبھاؤں گا۔ بیٹی کو بیٹی کہہ کر نہیں پکاروں گا لیکن اسے خالی ہاتھ رخصت کیا تھا' دل میں پھانس سی تھی۔ آج اللہ نے اتنا نوازا تو خیال آیا کہ یہ پھانس بھی نکال دوں۔ اس چیک کو ایک نادار لیکن خوش نصیب باپ کی طرف سے جہیز سمجھ کر قبول کر لو اور اسے جس طرح چاہو' خرچ کر لو۔ اسی میں میری خوشی ہے۔

دعاؤں کے ساتھ

نجم الحسن

رقعے کے ساتھ چیک منسلک کر کے اس نے چوکیدار کو دے دیا۔ "یہ اپنے چھوٹے صاحب کو دے دینا۔"

اے اللہ' تیرا شکر ہے اے اللہ.......... بارہ بجے کے قریب وہ اپنے ٹھکانے پر آ بیٹھا۔

اس شام وہ مغرب کی نماز پڑھ کر گھر آیا تو دروازے پر ایک کار کھڑی نظر آئی۔ وہ اندر داخل ہوا تو سب سے پہلے اس کی نظر زیبا پر پڑی۔ زیبا اسے دیکھتے ہی لپکی اور اس سے لپٹ گئی۔ "بابا.......... میرے بابا۔"

"بٹیا تو!" اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔ اتنے میں اندر کمرے سے دو افراد نکلے۔ ایک معمر اور دوسرا نوجوان۔ صغریٰ ان کے ساتھ تھی۔

"آ.......... آپ.......... آپ.........." وہ ہکلایا۔

"میں حمیدالدین ہوں۔" معمر آدمی نے کہا اور اس کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ نجمی نے زیبا کو ایک طرف ہٹا کر اس سے ہاتھ ملایا۔

"زیبا کے سسر..........؟" اس نے صغریٰ کی طرف دیکھا۔

"سسر نہیں باپ۔" حمیدالدین نے جلدی سے کہا۔ "اور میں آپ سے بہت شرمندہ ہوں۔ میں اپنی اور وحید کی طرف سے آپ سے معافی مانگتا ہوں۔ انجانے میں آپ اور زیبا کے ساتھ بڑی زیادتی ہوئی جس کی تلافی نہیں ہو سکتی۔ کاش وحید نے مجھے سب کچھ بتا دیا ہوتا۔ یہ مجھے غلط سمجھتا رہا.......... نہیں جانتا تھا کہ جب آدمی کچھ گنوا دیتا ہے تو اس کا دماغ درست ہو جاتا ہے اور میرا تو سب ہی کچھ لٹ گیا تھا۔ تم جو کوئی بھی تھے' میرے بھائی تھے۔ میرے محسن تھے۔ تم نے تو میرا گھر بھر دیا تھا۔ میں تو عمر بھر تمہیں خود سے بڑا سمجھوں گا.........."

"میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا.........." نجمی نے پیشانی مسلتے ہوئے کہا۔

"اگر چوکیدار نے وہ رقعہ مجھے نہ لا کر دیا ہوتا تو نہ جانے یہ زیادتی اور کب تک

جاری رہتی۔" حمیدالدین نے وضاحت کی۔

وحید آگے بڑھ آیا۔ "میں بہت شرمندہ ہوں انکل۔" اس نے ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا۔ "مجھے معاف کر دیں پلیز۔"

نجمی نے اسے سینے سے لگا لیا۔ حمیدالدین نے چیک نجمی کی طرف بڑھایا۔

"یہ کیا؟"

"اس کی ضرورت نہیں میرے بھائی۔" حمیدالدین نے کہا۔ "تم نے تو مجھے کھوئی ہوئی بیٹی دے دی جو مجھے کبھی نہیں مل سکتی تھی۔ بے بدل شے۔"

"نہیں بھائی صاحب! یہ میری زندگی کی سب سے بڑی خوشی ہے۔"

حمیدالدین ہچکچاتے ہوئے بولے۔ "ٹھیک ہے بھائی! میں بحث نہیں کروں گا' اب چلیں۔"

"نہیں کھانا کھائے بغیر میں نہیں جانے دوں گا آپ کو۔" نجمی نے کہا۔

"نہیں بھائی ہم تو آپ کو اور بہن جی کو لینے آئے ہیں۔" حمیدالدین نے صغریٰ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "کھانا وہیں کھائیں گے اور کل آپ کے ہاں دعوت اڑائیں گے۔"

"ٹھیک ہے بھائی صاحب۔" نجمی مسکرا دیا۔

اے اللہ' تیرا شکر ہے۔ اے اللہ..........

☆------☆------☆

زندگی شکر کے راستے پر رواں رہی۔ نجمی کی زبان' سانسیں اور دھڑکنیں خدا کا شکر ادا کرتی رہیں۔ ایک دن وہ اپنے ٹھکانے پر آنکھیں موندے مجسم شکر بنا بیٹھا تھا۔ اچانک اسے اپنے قریب کسی کی موجودگی کا احساس ہوا۔ اس نے آنکھیں کھول کر دیکھا کہ ایک عورت گود میں بچہ لئے بیٹھی زار و قطار رو رہی تھی۔

"کیا بات ہے بی بی؟" اس نے پوچھا۔

"میرا بچہ بہت بیمار ہے بابا۔"

"تو اسے ڈاکٹر کے پاس یا اسپتال لے جاؤ۔"

"ڈاکٹروں نے جواب دے دیا ہے بابا۔ اب بس تم ہی کچھ کر سکتے ہو۔"

"میں......... میں کیا کر سکتا ہوں؟" وہ گڑبڑا گیا۔

"مجھے نہیں معلوم' بس مجھے بشارت ہوئی ہے خواب میں......... یہاں آنے کو کہا گیا تھا۔ بابا خدا کے واسطے دعا کرو' میرے بچے کے لئے۔"

"اچھا بی بی کروں گا۔"

"ابھی کر دو میرے سامنے۔"

"اچھا بی بی۔" نجمی نے کہا۔ وہ دیکھ رہا تھا کہ عورت یوں اس کی جان نہیں چھوڑے گی۔ اسے ترس بھی آ رہا تھا اس پر۔ "لیکن بی بی......... میں کوئی بزرگ نہیں ہوں۔" اس نے آخری کوشش کی۔

"ہوا نہیں' میرے بچے کے لئے دعا کرو۔"

نجمی نے سر جھکایا اور گڑگڑا کر کہا۔ "اے اللہ' اپنی رحمت سے اس عورت کے بچہ کو شفائے کاملہ عطا فرما۔"

عورت بچے کو لے کر چلی گئی' وہ دو دن بعد پھر آئی۔

"اب کیا ہے؟" نجمی نے پوچھا۔

"میرا بچہ اچھا ہو گیا ہے۔"

"اللہ کا شکر ہے بی بی' اللہ کا شکر ادا کیا کرو۔"

"ضرور کروں گی بابا۔ مگر اس وقت تمہارا شکریہ ادا کرنے آئی ہوں۔"

اس کے بعد تو یہ سلسلہ شروع ہو گیا۔ طرح طرح کے لوگ آنے لگے۔ کسی پر جادو کا اثر تھا' کسی کا شوہر ہاتھ سے نکلا جا رہا تھا تو کسی کو صحت کی طرف سے پریشانی تھی۔ نجمی حیران و پریشان تھا۔ اس کی تو داڑھی بھی نہیں تھی لیکن اس کے لاکھ انکار کے باوجود اس سے دعا کرائے بغیر کوئی ٹلتا نہیں تھا۔ وہ عاجز آ گیا۔ اتنے لوگ آنے لگے تھا کہ اس کی چاکری میں بھی خلل پڑنے لگا تھا اور یہ بات اسے گوارا نہیں تھی۔ اس نے فیصلہ کیا کہ وہ گھر بیٹھ کر ہی چاکری کرے گا لیکن نو بجے کے بعد گھر بیٹھنے سے اسے وحشت ہونے لگی۔ ارتکاز ہی نہیں رہا۔ لگتا تھا' وہ شکر ادا کرنا بھول رہا ہے۔ اس کے اندر کسی نے کہا۔

"نجمی' اللہ کو تیری وہیں کی چاکری قبول ہے بس۔" وہ شکر کے دھاگے سے بندھا وہیں پہنچ گیا۔

اب تو لگتا تھا' پورا شہر اس کے پاس آتا ہے۔ آخر کار اسے سوجھ ہی گئی کہ یہ لوگ مجھے جعلی پیر بنا رہے ہیں تو کیوں نہ بن ہی جاؤں۔ اس نے سوچا۔ یہ بھی مطمئن رہیں گے اور میری چاکری بھی چلتی رہے گی۔ شکر ادا کرنے میں خلل نہیں پڑے گا۔ اگلے ہی روز وہ ایک کتاب میں کاغذ کے تہہ کئے ہوئے کچھ پرزے لے آیا۔ اسے شرمندگی تو ہو رہی تھی لیکن یہ خیال بھی تھا کہ اللہ نیتوں کا جاننے والا ہے۔

اب جو کوئی بھی آ کر اپنا مسئلہ بیان کرتا' وہ آنکھ کھول کر اسے دیکھے بغیر کتاب میں سے ایک پرزہ نکالتا اور اسے دے دیتا۔ "اسے بازو پر باندھ لو اور اللہ کا شکر ادا کیا کرو۔" وہ کہتا' پھر اس نے یہ کہنا بھی چھوڑ دیا۔ اب اس کی زبان شکر کے لئے آزاد تھی۔ تعویذ ختم ہو جاتے تو وہ کہتا۔ "کل آنا۔"

اب وہ صبح نو بجے سے پانچ بجے تک وہاں بیٹھتا اور عشا کے بعد گھر پر بیٹھ کر تعویذ لکھتا۔ اب سو تعویذ بھی کم پڑنے لگے تھے۔ تعویذ ختم ہو جاتے تو اس کی زبان کی آزادی شکر بھی چھن جاتی لہٰذا وہ زیادہ سے زیادہ تعویذ لکھ کر لاتا۔ اسے علم ہی نہیں تھا کہ وہ شہر بھر میں نجمی بابا کے نام سے مشہور ہو گیا تھا۔

ایک صبح پیڑ کے پاس ایک کار آ کر رکی۔ ایک شخص کار سے اتر کر اس کے پاس آ بیٹھا۔ "بابا جی' میرا کاروبار ٹھپ ہو رہا ہے' دعا کریں۔"

نجمی نے ایک تعویذ نکال کر اس کی طرف بڑھا دیا۔ وہ شخص تعویذ لے کر کار میں بیٹھا اور واپس چلا گیا۔ وہ شہر کا مشہور عامل دلدار رضوی تھا۔ ایک بڑے چوک پر اس نے اپنی عملیات کی دکان سجا رکھی تھی۔ بہت اچھا دھندا چل رہا تھا۔ نجمی بابا کی شہرت سن کر اسے اچھوتا خیال سوجھا تھا۔ بتانے والے بتاتے تھے کہ نجمی بابا گھر سے تعویذ لکھ کر لاتا اور ضرورت مندوں کو بند آنکھوں سے ایک تعویذ نکال کر دے دیتا ہے' اور ہر شخص کی حاجت پوری ہو جاتی ہے۔ اس کا صاف مطلب یہ تھا کہ ہر تعویذ ایک سا ہی ہوتا ہو گا۔ گویا ہر مسئلے کا ایک ہی حل۔ دلدار رضوی کو یقین ہو گیا کہ نجمی بابا کے پاس اسم اعظم ہے

اور اسے حاصل کرنا کچھ دشوار بھی نہیں۔

یہی سوچ کر وہ آج تعویذ لینے آگیا تھا اور اب خوش خوش واپس جا رہا تھا۔ اس کے جسم میں سنسنی دوڑ رہی تھی۔ کائنات کا سب سے بڑا راز اس کے ہاتھ لگ گیا تھا' اس پر کھلنے والا تھا۔ کائنات کا سب سے بڑا راز!

اپنے ٹھکانے پر پہنچ کر اس نے دروازہ بند کر لیا اور اپنی کرسی پر بیٹھ کر قمیض کی جیب سے تعویذ نکالا۔ اس کا دل بری طرح دھڑک رہا تھا۔ جسم کا ہر مسام پسینہ اگل رہا تھا۔ اس نے لرزتی انگلیوں سے تعویذ کی تہیں کھولنی شروع کیں۔ اسم اعظم' کائنات کا سب سے بڑا راز! اب کھلا ہوا کاغذ اس کے سامنے تھا اور وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے اسے گھور رہا تھا۔ مایوسی نے اس کے وجود کو شل کر کے رکھ دیا تھا۔ کاغذ پر بہت نفیس اور خوشنما تحریر میں لکھا تھا۔ اے اللہ تیرا شکر ہے۔

اس نے کاغذ کی گولی سی بنائی اور ڈسٹ بن میں پھینک رہا تھا کہ کچھ خیال آ گیا۔ اس نے کاغذ کو میز کی دراز میں ڈالا اور دراز بند کر دی۔ اس کی مایوسی اور جھنجلاہٹ کی کوئی حد نہیں تھی۔

اسم اعظم! کائنات کا سب سے بڑا راز!

اے اللہ' تیرا شکر ہے۔ اے اللہ ....

☆======☆======☆

اندھی گلی

ذریعہ معاش کی تلاش، سہاروں کی جستجو اور محبت کی طلب کبھی کبھی انسان کو ایسی اندھی گلیوں میں لے جاتی ہے جہاں سے واپسی کا راستہ بہت کٹھن ہوتا ہے۔

ایک سیدھی سادی لڑکی کی کہانی جو ایک ان دیکھے جال میں پھنس گئی تھی۔

جیسے ہی لائٹ گئی' اس کی آنکھ کھل گئی۔ اس کا سسٹم ہی کچھ ایسا تھا۔ حالانکہ خواب گاہ میں محض مدہم روشنی کا بلب جل رہا تھا اور وہ خاصی گہری نیند سو رہی تھی لیکن ہمیشہ ایسا ہی ہوتا تھا۔ نائٹ بلب کی روشنی کے بغیر وہ سو ہی نہیں سکتی تھی۔ لائٹ جاتے ہی اس کا اٹھ جانا لازم تھا۔

وہ اٹھ بیٹھی لیکن وہ خوفزدہ نہیں تھی۔ اسے اندھیرے سے خوف نہیں آتا تھا بلکہ اندھیرا اسے بے حد رومان انگیز محسوس ہوتا تھا۔ ایسے میں اس کے جسم میں یہ احساس سنسنی کی طرح دوڑ جاتا تھا کہ کچھ ہونے والا ہے۔ یہی وجہ تھی کہ اندھیرے سے خوف نہ آنے کے باوجود وہ اندھیرے میں سو نہیں سکتی تھی۔

اس نے عادتاً سرہانے رکھی ہوئی زرد چادر اٹھائی اور بستر سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ وہ کاسنی رنگ کے لباس میں تھی۔ وہ بیڈروم سے نکلی اور سٹنگ روم میں چلی آئی۔ اندھیرے کی وجہ سے اسے دشواری ہوئی لیکن اس نے موم بتی نہیں جلائی' وہ اس رومان انگیز ماحول کو تباہ نہیں کرنا چاہتی تھی۔ چنانچہ اندھوں کی طرح ٹٹول ٹٹول کر آگے بڑھتی رہی۔

اپنا سٹنگ روم اسے بے حد پسند تھا۔ اس کی تعمیر اور آرائش کے سلسلے میں اس نے بہت مغز ماری کی تھی۔ وہ فرنیچر سے بچتی بچاتی سامنے والی دیوار کی طرف بڑھ گئی جس کے دوسری طرف سڑک تھی۔ دیوار کے پاس پہنچ کر اس نے سبز پردوں کو ایک طرف سمیٹا۔ سٹنگ روم کی وہ دیوار درحقیقت شیشے کی تھی۔ پوری دیوار پر لکڑی کے فریموں کا جال سا تھا اور فریموں کے درمیان شیشے لگے تھے جن سے باہر کا منظر صاف دیکھا جا سکتا تھا لیکن اس وقت باہر دیکھنے کو تھا ہی کیا سوائے تاریکی کے' البتہ پردے سمیٹنے سے یہ ضرور

ہوا کہ تاریکی کا احساس قدرے کم ہو گیا' کینوس جو وسیع ہو گیا تھا۔

وہ پُرستائش نظروں سے سٹنگ روم کو دیکھتی رہی۔ وہ امریکن سٹائل کا پارلر تھا۔ چند لمحے بعد وہ شیشے کی دیوار کے پاس جا کھڑی ہوئی اور باہر دیکھنے لگی۔ جس جگہ وہ کھڑی تھی' وہاں سے ایک سڑک اس کی سیدھ میں جاتی تھی اور دوسری سڑک شیشے کی دیوار کے متوازی تھی۔ وہ شیشے ایسے تھے کہ ان سے باہر تو دیکھا جا سکتا تھا لیکن باہر کھڑے ہوئے کسی شخص کے لئے اندر دیکھنا ممکن نہیں تھا۔

وہ کچھ دیر کھڑی رہی پھر اچانک اسے دیوار کے پیش منظر میں کوئی بیس گز دور ایک سفید چیز نظر آئی۔ وہ چیز معلق تھی' وہ حیرت سے دیکھتی اور سوچتی رہی کہ یہ کیا ہو سکتا ہے پھر اس چیز کے قریب ایک اور چمک دار چیز نظر آئی۔ اس بار اس کی سمجھ میں آ گیا۔ وہ دوسری چیز یقینی طور پر ریڈیم ڈائل والی گھڑی تھی۔ اس کے ساتھ ہی اسے پتہ چل گیا کہ پہلے نظر آنے والی سفید چیز فیلٹ ہیٹ ہے۔ گویا وہ کوئی شخص تھا جو گھڑی میں وقت دیکھ رہا تھا۔ وہ سامنے والی سڑک کے دائیں سمت تھا۔ اسی وقت اس نے اس شخص کے مقابل سڑک کے بائیں طرف ایک اور شخص کو دیکھا' وہ بھی صرف اپنی سفید ٹوپی ہی کی وجہ سے نظر آیا۔ وہ حیرت سے دیکھتی رہی۔ معاملہ اسے کچھ پُراسرار معلوم ہو رہا تھا۔

اچانک دور سے ننھی منی روشنیاں حرکت کرتی نظر آئیں۔ وہ اس کی سمت پیش قدمی کر رہی تھیں اور جیسے جیسے قریب آ رہی تھیں ان کا حجم بڑھتا جا رہا تھا۔ چند لمحوں کے بعد اسے اندازہ ہو گیا کہ وہ ایک کار ہے۔ کار اب کافی قریب آ گئی تھی اور وہ واضح طور پر اسے دیکھ سکتی تھی۔ وہ پرانے ماڈل کی کار تھی.......... اس نے سڑک کے دونوں طرف موجود افراد کو اپنی اپنی سمت دیوار کے ساتھ دبکتے دیکھا۔ اگلے ہی لمحے اس کے جسم میں سنسنی دوڑ گئی۔ ان دونوں کے پاس خودکار گنیں تھیں اور وہ گنیں بلند ہو رہی تھیں۔ دوسری طرف کار بدستور بڑھ رہی تھی۔ کار ڈرائیور اس بات سے بے خبر تھا کہ وہاں دو افراد اس کے لئے گھات لگائے بیٹھے ہیں۔

سفید ہیٹ والا اور اس کا ساتھی' دونوں پوری طرح تیار تھے۔ وہ ان کے انداز سے وہ سمجھ گئی۔ اس نے چیخنا چاہا لیکن اس کے حلق سے آواز نہیں نکلی۔ کار بہت قریب آ گئی

تھی۔

اور پھر جو کچھ ہوا۔ بہت تیزی سے ہوا۔ سڑک کے اطراف موجود دونوں افراد نے فائرنگ شروع کر دی۔ کار کسی شرابی کی طرح ڈگمگائی۔ ڈرائیور نے بریک لگائے.......... کار سٹنگ روم کی شیشے والی دیوار سے ذرا سی دور رکی۔ ڈرائیور نے تیزی سے دروازہ کھولا' باہر نکلا' وہ یقیناً زخمی تھا۔ دوسری طرف سڑک کے دونوں جانب سے مسلح افراد نمودار ہوئے۔ انہوں نے فائر کئے اور کار کا نوجوان ڈرائیور ایک چیخ مار کر ڈھیر ہو گیا۔ وہ کار کے بمپر کے عین سامنے گرا تھا اور یقینی طور پر ختم ہو چکا تھا۔ اس کے قاتل آگے بڑھے۔ سفید ہیٹ والے نے اپنی گن جھکا لی تھی جبکہ سفید ٹوپی والا ابھی تک چوکنا تھا۔

وہ پورا منظر کسی فلم سے متعلق معلوم ہوتا تھا۔ کار کی ونڈ شیلڈ میں دونوں جانب کئی سوراخ تھے۔ شیشہ کئی جگہ سے چٹخ گیا تھا۔ اس پر خون کے چھینٹے بھی تھے۔ کار کی چھت پر اور سامنے والی جالیوں پر بھی گولیوں کے کئی سوراخ تھے۔ البتہ اس کی ہیڈلائٹس اب بھی روشن تھیں۔

سفید ہیٹ والے نے جھک کر اپنے شکار کو دیکھا پھر اسے مردہ پا کر مطمئن ہو گیا۔ اس کے بعد وہ کھڑا ہو گیا.......... اور اچانک ہی اس کی نظر شیشے کی دیوار پر پڑی۔ یاسمین کو ایسا لگا جیسے وہ براہ راست اس کی آنکھوں میں دیکھ رہا ہے۔ وہ جانتی تھی کہ باہر سے اندر کا منظر دیکھنا ناممکن ہے لیکن آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھے جانے کا احساس بدستور تھا۔ بے شک قاتل اسے نہیں دیکھ سکتا تھا لیکن اسے اس کی موجودگی کا شک تو ہو سکتا تھا۔ ایسے میں وہ واحد عینی شاہد کو مٹانے کے لئے کیا کر سکتا تھا؟ وہ پوری دیوار کو چھلنی کر سکتا تھا اور یقیناً وہ شکار ہو جاتی' بچنے کا کوئی سوال ہی نہیں تھا۔ اس نے پلٹ کر سٹنگ روم کے اندرونی دروازے کی طرف دیکھا جو اسے بہت دور نظر آیا۔ وہاں تک پہنچتے پہنچتے تو اس کے جسم میں درجنوں گولیاں پیوست ہو جاتیں۔ وہ پلٹی۔ قاتل بدستور اس کی آنکھوں میں دیکھ رہا تھا۔ اس کے ہونٹوں پر بے حد سفاک مسکراہٹ تھی۔ یاسمین کو ایسا لگا جیسے اس کے جسم کی تمام قوت سلب کر لی گئی ہے۔ اب وہ ہل بھی نہیں سکتی تھی۔ پھر آہستہ آہستہ قاتل نے اپنی گن بلند کی۔ یاسمین نے چیخنے کی کوشش کی اور مسلسل کوشش

کرتی رہی۔ بالآخر اس کے حلق سے ایک طویل چیخ آزاد ہوئی۔

☆------☆------☆

یاسمین خود اپنی چیخ سن کر بیدار ہوئی۔ کمرے میں گہری تاریکی تھی۔ نائٹ بلب بھی بجھ چکا تھا۔ شاید کچھ دیر پہلے لائٹ چلی گئی ہوگی۔ وہ گھبرا کر اٹھ بیٹھی۔ اس کا جسم سوکھے پتے کی طرح کانپ رہا تھا اور وہ پسینے میں شرابور تھی۔

اچانک لائٹ آگئی' نائٹ بلب روشن ہو گیا۔ اس کی کچھ جان میں جان آئی۔ اس نے اٹھ کر کمرے کی لائٹ آن کی اور دوبارہ بستر پر آ بیٹھی۔ اس نے سرہانے سے گھڑی اٹھا کر وقت دیکھا' چار بجے تھے۔ اب اتنا خوفناک خواب دیکھنے کے بعد سونے کا تو سوال ہی نہیں تھا۔ وہ خواب کے اور اس کے اسباب کے متعلق سوچنے لگی۔

وہ تنہا تھی۔ نہ ماں باپ' نہ بہن بھائی۔ اسے اس کی خالہ نے پالا تھا جو راجن پور میں رہتی تھیں۔ انہوں نے ہی اسے تعلیم دلائی تھی جس کے نتیجے میں اب وہ اپنے پیروں پر کھڑی تھی۔ اس خوفناک خواب کا سبب یہی ہو سکتا تھا کہ وہ انگریزی کے سنسنی خیز ناول کثرت سے پڑھتی تھی۔ خواب میں امریکن طرز کا پارلر دیکھنے کا سبب بھی یہی تھا۔ ناولوں نے اس کی شخصیت پر گہرے اثرات مرتب کئے تھے۔ وہ آزاد خیال تھی' مرد اور عورت کی دوستی کی قائل تھی اور اسے ایڈونچر بہت پسند تھا۔ بے باک ہونے کے باوجود اس نے کبھی بے راہ روی قبول نہیں کی تھی۔

وہ ٹالبوٹ اینڈ کمپنی میں ایگزیکٹو منیجر کی سیکرٹری تھی۔ یہ سوچتے سوچتے اسے خیال آیا کہ اسے آج آفس بھی نہیں جانا ہے بلکہ اب کبھی بھی نہیں جانا ہے۔ حکومت کی کاروباری پالیسیوں کے خلاف احتجاج کے طور پر ٹالبوٹ کے مالکان نے فرم کو بند کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ گذشتہ رات اس سلسلے میں ملازمین کو الوداعی پارٹی دی گئی تھی۔ وہ خود اس پارٹی سے ایک بجے ہی تو واپس آئی تھی۔

اچانک اسے زبردست شاک لگا۔ اس کے رونگٹے کھڑے ہو گئے' اس کا جسم پھر لرزنے لگا۔ اس کی سمجھ میں خوفناک خواب کا اصل سبب آگیا تھا۔

پارٹی سے گھر واپس آتے ہوئے اس نے قتل کی ایک حقیقی واردات دیکھی

تھی......... اپنی آنکھوں سے......... اور اس نے قاتل کا چہرہ بھی دیکھا تھا۔ اس کی آنکھوں کے سامنے پورا منظر پھر گیا۔

☆------☆------☆

وجہ تو معلوم نہیں' البتہ پارٹی میں وہ بے حد بور ہو رہی تھی۔ جمی نے اس کی اکتاہٹ کو محسوس کر لیا تھا۔ جمی بھی کمپنی میں ایگزیکٹو کے عہدے پر فائز تھا۔ وہ بور ہو کر باہر نکل آئی تھی اور جمی بھی چند لمحے بعد اس کے پاس چلا آیا تھا۔ چند لمحے کی رسمی گفتگو کے بعد جمی نے کہا۔ "اب تم کیا کرو گی؟"

"ملازمت تلاش کروں گی۔"

"میں تمہاری مدد کر سکتا ہوں۔ ایسا کرو' میرے ساتھ میرے انکل کے گھر چلو۔ ان کے ہاں آج پارٹی ہے' وہاں میں تمہاری ملازمت کی بات بھی کرا دوں گا۔"

ایڈونچر پسند اور رجائی یاسمین اس کی باتوں میں آ گئی۔ باہر جمی کی کار موجود تھی۔ جمی کے انکل کے گھر پہنچ کر پتہ چلا کہ جمی کی نیت ٹھیک نہیں ہے۔ جمی کے انکل دو ہفتے پہلے امریکا چلے گئے تھے۔ جمی نے وہاں پہنچتے ہی دست درازی شروع کر دی۔ یاسمین نے بے حد سمجھ داری سے کام لیا اور اسے بہلاتی رہی۔ وہ بے حد سنسان علاقہ تھا۔ وہ جانتی تھی کہ چیخ و پکار سے کام نہیں چلے گا۔ مزاحمت کا بھی کوئی فائدہ نہیں تھا۔ وہ جمی کے سامنے کوئی حیثیت نہیں رکھتی تھی۔ اس نے خود سپردگی کا مظاہرہ کیا لیکن درد سر کا بہانہ بھی کیا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ جمی اس کے لئے کافی بنانے چلا گیا۔ جمی کے جاتے ہی وہ بڑی آہستگی سے بنگلے سے نکل آئی۔ بنگلے سے نکلتے ہی اس نے بھاگنا شروع کر دیا۔ یہ اس کی خوش قسمتی تھی کہ اسے ٹیکسی مل گئی۔ ٹیکسی ڈرائیور نے اسے عجیب سی نظروں سے دیکھا اور وہ پانی پانی ہو گئی۔ بہرحال گھر پہنچنا زیادہ اہم تھا۔

سڑکیں سنسان تھیں۔ اب ٹیکسی ان علاقوں سے گزر رہی تھی جہاں رہائشی ہوٹل ترتیب سے واقع تھے۔ ایسے ہی ایک ہوٹل کے سامنے اس نے وہ واردات ہوتے دیکھی۔ سامنے سے ایک کار آ رہی تھی۔ اس کی رفتار خوفناک حد تک تیز تھی اور ہیڈلائٹس کی روشنی بھی بے حد تیز تھی۔ ٹیکسی ڈرائیور نے ٹیکسی کی رفتار کم کی اور اسے

سائیڈ میں کر لیا۔ مخالف سمت میں ایک شخص فٹ پاتھ پر چل رہا تھا۔ اس نے پلٹ کر کار کی طرف دیکھا اور اچانک بھاگنا شروع کر دیا۔ اس کے چہرے پر دہشت تھی۔ کار خاصی دور تھی لیکن اس کی رفتار بہت زیادہ تھی۔ پلک جھپکتے میں وہ بھاگتے ہوئے شخص کے سر پر پہنچ گئی۔ کار کے ڈرائیور نے کار فٹ پاتھ پر چڑھا دی۔ فضا میں ایک کریہہ چیخ گونجی۔ بھاگنے والا شخص پہیوں تلے آ کر کچلا گیا تھا۔ اس کے بچنے کا کوئی سوال ہی نہیں تھا۔ کار کے ڈرائیور نے کار کو فٹ پاتھ سے اتارا' ایک لمحے کے لئے کار کی رفتار کم ہوئی اور پھر وہ گولی کی طرح نکلتی چلی گئی۔

ٹیکسی ڈرائیور نے بریک لگائے۔ چند لمحے تو ساکت بیٹھا رہا پھر وہ اترا اور کار کے شکار کی طرف بڑھ گیا۔ یاسمین بھی اتر رہی تھی لیکن ڈرائیور نے ہاتھ کے اشارے سے اسے منع کر دیا۔ یاسمین ٹیکسی میں ہی بیٹھی رہی۔ رات بہت ہو چکی تھی۔ اس کے باوجود ہوٹلوں سے اچھے خاصے لوگ نکل آئے۔

کچھ ہی دیر میں پولیس آ گئی۔ ایک پولیس افسر یاسمین کے پاس آیا۔ پہلے تو اس نے یاسمین سے پوچھا کہ وہ کہاں سے آ رہی ہے پھر اس نے پوچھا کہ کیا اس نے کار ڈرائیور کا چہرہ دیکھا تھا؟

"میں نے اس کی ایک جھلک دیکھی تھی۔" یاسمین نے پوری سچائی سے کہا۔ "وہ دانت نکال کر ہنس رہا تھا۔ اس کا چہرہ بڑی حد تک بگڑا ہوا تھا۔ ایسا لگتا تھا کہ وہ اپنے شکار کی بے بسی پر محظوظ ہو رہا ہے۔ اس کی آنکھوں میں سفاکی تھی اور ہنسنے کے انداز میں بھی۔ اس کی عمر پچیس تیس کے لگ بھگ ہو گی۔ بال گھنگریالے تھے' وہ یقیناً خوبرو تھا لیکن اس وقت ہرگز نہیں لگ رہا تھا۔ میں اس کے چہرے کے تاثر کو بیان نہیں کر سکتی۔"

پولیس افسر نے اس کا پتہ نوٹ کرنے کے بعد اسے فوراً ہی گھر جانے کی اجازت دے دی تھی' وہ گھر پہنچتے ہی سو گئی تھی اور اب اس خوفناک خواب نے اسے جگا دیا تھا۔ یہ سوچ کر کہ آفس نہیں جانا ہے' اسے خاصا سکون ہوا۔ اس نے بستر پر لیٹ کر آنکھیں موند لیں۔ کچھ دیر بعد اسے نیند آ گئی۔

☆------☆------☆

اگلے چند روز ملازمت کی تلاش اور پولیس کے چکر میں گزرے۔ پولیس کو وہ سبز ڈاٹسن مل گئی تھی جس سے ہوٹل کے مالک کو کچل کر ہلاک کیا گیا تھا لیکن کار کے ڈرائیور کا سراغ ابھی تک نہیں مل سکا تھا۔ یہ طے ہو گیا تھا کہ قاتل نے کار چرائی تھی۔ کار کے اصل مالک نے وقوعے سے چند گھنٹے پیشتر کار کی گمشدگی کی رپورٹ درج کرائی تھی۔ اخبارات چند روز تک اس خبر کو اہمیت دیتے رہے پھر خبر کی اہمیت کم ہوتے ہوتے بتدریج معدوم ہو گئی۔ لاینحل کیسوں کی فائل میں ایک اور کیس کا اضافہ ہو گیا تھا۔

اس نے ملازمت کے حصول کے سلسلے میں اخبار میں اشتہار دیا تھا۔ ایک ہفتے بعد اسے ایک خط ملا۔ بیگم تمکین شاہ کو جو پہاڑی شہر رام گڑھ میں رہتی تھیں' ایک سوشل سیکرٹری کی ضرورت تھی۔ انہوں نے اسے ہدایت کی تھی کہ وہ ان کے وکیل سے انٹرویو کے سلسلے میں مل لے۔ چنانچہ وہ مقامی وکیل کے پاس گئی۔ انٹرویو بخیر و خوبی نمٹ گیا۔

"اس سے پہلے بیگم شاہ ملازمت کی شوقین خواتین کو موقع دیتی رہی ہیں۔" وکیل نے بتایا۔ "لیکن ایسے لوگ جنہیں ملازمت کی ضرورت نہ ہو' نہ تو مستعدی سے کام کرتے ہیں اور نہ کہنا مانتے ہیں۔ بیگم شاہ نے بھی کئی سیکرٹریز گنوا کر یہ فیصلہ کیا ہے کہ اس بار وہ کسی ضرورت مند کو رکھیں گی۔ آپ ضرورت مند ہیں نا؟" وکیل نے پوچھا۔

"جی ہاں' مجھے کام سے دلچسپی ہے۔" یاسمین نے جواب دیا۔

انٹرویو کے ایک ہفتے بعد بیگم شاہ کا خط آیا۔ انہوں نے یاسمین کو معقول تنخواہ کی پیشکش کی تھی۔ انہوں نے اسے جمعرات کے روز روانگی کی ہدایت کی تھی۔ اسٹیشن پر گاڑی اس کی منتظر ہوگی۔ انہوں نے گرم کپڑوں پر بالخصوص زور دیا تھا کیونکہ رام گڑھ میں پہاڑی علاقہ ہونے کی وجہ سے خاصی سردی پڑتی تھی۔

یاسمین بہت خوش تھی۔ وہ ملازمت کے سلسلے میں ایک ایسی جگہ جا رہی تھی' جہاں متوسط طبقے کے افراد تفریح کی غرض سے جانے کے محض خواب دیکھتے رہتے تھے۔ گویا روزگار کا روزگار اور تفریح کی تفریح۔ سب سے بڑی بات یہ تھی کہ اس رات کے بعد وہ شدت سے شہر چھوڑ دینے کی خواہش مند تھی۔ قاتل ڈرائیور کی صورت اس کی آنکھوں میں پھرتی رہتی تھی۔

اس نے کچھ گرم کپڑے خریدے اور جمعرات کو رام گڑھ کے لئے روانہ ہو گئی۔ اسٹیشن پر بیگم شاہ کا ڈرائیور نادر اس کا منتظر تھا۔ خاصا معمر آدمی تھا اور کم گو بھی۔ کار کا سفر خاصا طویل تھا اور یاسمین سوالات سے بھری ہوئی تھی لیکن نادر ہر سوال کا جواب ہاں یا نہیں میں دینے کی کوشش کرتا رہا تھا۔ چنانچہ یاسمین نے خاموشی کو بہتر سمجھا اور کھڑکی سے باہر دیکھنے لگی۔ رام گڑھ واقعی جنت نظیر علاقہ تھا۔ پھیپھڑوں میں اترنے والی ہوا بے حد شفاف اور تازہ محسوس ہو رہی تھی۔ سینے میں جیسے روشنی سی اترتی جا رہی تھی۔

بالآخر کار پتھر کے بنے ہوئے ایک محرابی گیٹ میں داخل ہوئی۔ ڈرائیو وے کے اطراف میں بید مجنوں کے درختوں کی قطار تھی۔ قریب ہی ایک پہاڑی چشمہ گنگنا رہا تھا۔ مکان قدیم طرزِ تعمیر کا نمونہ تھا اور بے حد حسین تھا۔ نادر نے گاڑی پورچ کے سامنے روک دی اور باہر نکل کر اس کے لئے دروازہ کھولا۔ وہ کار سے اتر آئی۔

"میں کار گیراج میں لے جا رہا ہوں پھر آپ کا سامان اندر لے آؤں گا۔" نادر نے کہا۔

اسی وقت مکان کا دروازہ کھلا اور ایک جوان العمر شخص نمودار ہوا۔ اس نے یاسمین کو مسکرا کر دیکھا اور بولا۔ "میں آپ کو شاہ پیلس میں خوش آمدید کہتا ہوں مس۔"

یاسمین نے نظریں اٹھا کر دیکھا' وہ مسکرائی پھر اس نے نوجوان کے چہرے کو پوری طرح دیکھا اور بری طرح لرز کے رہ گئی۔ وہ سبز ڈاٹسن کے اس ڈرائیور کا چہرہ معلوم ہو رہا تھا جس نے اس رات ہوٹل کے مالک کو کچلا تھا۔ فرق صرف تاثر کا تھا اور بہت بڑا فرق تھا یہ........ وہ چہرہ جس قدر ناخوشگوار تھا' یہ چہرہ اتنا ہی خوشگوار تھا۔

یاسمین نے بہت تیزی سے خود کو سنبھالا لیکن اسے ایک لمحے کے لئے ایسا لگا جیسے نوجوان نے اس کے انداز کی تبدیلی کو محسوس کر لیا ہے۔ اب وہ آنکھیں سکیڑ کر اسے دیکھ رہا تھا لیکن پھر اسے ایسا لگا کہ وہ محض اس کا وہم تھا۔

"میرا نام حارث شاہ ہے۔" جوان العمر شخص نے کہا۔ "ممی یقیناً آپ کو دیکھ کر خوش ہوں گی۔"

چند لمحے بعد یاسمین کو پتہ چل گیا کہ نوجوان نے غلط نہیں کہا تھا۔ بیگم شاہ اسے دیکھ

کر کھل اٹھیں۔ "مجھے تمہاری آمد سے خوشی ہوئی۔ میری ڈنر پارٹی تباہ ہونے سے بچ گئی۔" بیگم شاہ نے کہا۔ پھر انہوں نے حارث سے اس کا تعارف کرایا۔ "یہ میرا بیٹا حارث ہے۔"

"ممی کو ڈنر پارٹی کی فکر ہے کیونکہ ناصرہ اچانک ہی چلی گئی ہے۔" حارث نے وضاحت کی۔

"ناصرہ میری یتیم بھانجی ہے۔ اکثر میرا ہاتھ بٹاتی ہے۔" بیگم شاہ نے کہا پھر اچانک پوچھا۔ "تم پھول سجانا جانتی ہو؟"

"جی ہاں یقیناً۔" یاسمین کے بجائے حارث نے جواب دیا۔ "یہ بہت اہل لڑکی معلوم ہوتی ہیں' ہر کام کر سکتی ہیں' سوشل سیکرٹری جو ہوئیں۔"

یاسمین گھبرا گئی۔ اس نے شوقیہ یہ کام کیا تو تھا لیکن اسے اس کام کا کوئی خاص تجربہ نہیں تھا۔ "جی ہاں' میں پھول سجا سکتی ہوں۔" اس نے کمزور لہجے میں کہا۔

بیگم شاہ نے گھنٹی بجا کر خادمہ کو طلب کیا۔ خادمہ' یاسمین کو اوپر لے گئی۔ وہ دوسری منزل کی کئی راہداریوں سے گزری۔ یاسمین کو وہ مکان بھول بھلیاں محسوس ہونے لگا۔ وہ راستہ یاد نہیں کر سکی تھی۔ اسے ڈر تھا کہ تنہا ہونے کی صورت میں وہ بھٹک جائے گی اور اِدھر اُدھر چکراتی پھرے گی۔ اب وہ یاد کرنے کی کوشش کر رہی تھی کہ پہلی بار دائیں جانب اور دوسری بار بائیں جانب مڑی تھی۔ اس کے بعد اسے کچھ یاد نہیں تھا' وہ الجھ کر رہ گئی۔ لیکن اپنا کمرہ دیکھ کر سب کچھ بھول گئی۔ وہ بے حد وسیع و عریض اور خوبصورت کمرہ تھا۔ اس کا سامان پہلے ہی کمرے میں پہنچ چکا تھا۔ خادمہ سامان کھول کر اسے قرینے سے رکھنے میں مصروف ہو گئی۔ یاسمین کمرے کا جائزہ لیتی رہی پھر اس نے کپڑے نکالے اور باتھ روم میں چلی گئی۔

وہ کپڑے بدل کر نکلی تو حارث کمرے میں موجود تھا۔ وہ اسے دوسرے کمرے میں لے گیا جہاں پھول موجود تھے.......... بہت سارے پھول۔ "مجھے پھولوں کا ذرا بھی تجربہ نہیں۔" حارث نے کہا۔ "پھر بھی میں تمہاری مدد کر سکتا ہوں۔"

یاسمین ہنس دی پھر وہ فوراً ہی پھولوں کو سیٹ کرنے میں مصروف ہو گئی۔

☆------☆------☆

تمام کام نمٹ چکے تھے' پارٹی شروع ہو چکی تھی۔ پارٹی میں شریک مہمانوں سے یاسمین کا تعارف بیگم شاہ نے کرایا۔ ان میں جج شاکر علی بھی تھے جو ریٹائر ہو چکے تھے اور اب قریب ہی واقع اپنے کاٹیج میں مقیم تھے۔ ان کے ساتھ ان کا بھتیجا عامر بھی تھا جو ارضیات کا طالب علم تھا' ایم اے کر رہا تھا۔ وہ چھٹیاں گزارنے کے لئے اپنے چچا کے پاس آیا ہوا تھا اور رام گڑھ میں چٹانوں کی ساخت کے سلسلے میں تحقیقی کام کر رہا تھا۔ جج شاکر علی نے بتایا کہ ان دنوں وہ جرائم کے موضوع پر ایک کتاب لکھ رہے ہیں۔ اس سلسلے میں انہوں نے جج کی حیثیت سے اپنے تجربات سے استفادہ کیا ہے۔

حارث بہت اچھا لگ رہا تھا لیکن نہ جانے کیوں یاسمین اس سے خوفزدہ بھی تھی۔ وہ اس بارے میں سوچتی رہی۔ شاید اس کے خوف کا سبب یہ تھا کہ وہ قاتل ڈرائیور سے مشابہت رکھتا تھا لیکن یاسمین کو یقین تھا کہ حارث وہ ڈرائیور ہے نہیں۔

مہمانوں کے درمیان رام گڑھ میں حال ہی میں ہونے والی ڈاکہ زنی کی واردات کے بارے میں بات چل نکلی تھی۔ اس واردات میں ایک تقریب کے دوران جواہرات لوٹ لئے گئے تھے۔ حارث بے حد دلچسپی سے سن رہا تھا کیونکہ وہ تین ہفتے دارالحکومت میں گزارنے کے بعد دو دن پہلے ہی رام گڑھ واپس آیا تھا۔

یاسمین یہ سن کر چونکی۔ اس کا مطلب تھا کہ جس رات دارالحکومت میں قتل کی واردات ہوئی' حارث وہیں تھا۔

"آپ ڈاکو کو پہچان سکتی ہیں؟" جج صاحب نے بیگم باقر سے پوچھا جو اس تقریب میں شریک تھیں جس میں ڈاکہ زنی کی واردات ہوئی تھی۔

"میری شامت آئی ہے کیا؟" بیگم باقر نے کہا۔ ان کا جسم کپکپا اٹھا۔ "میں سن چکی ہوں کہ ایسے لوگوں کا کیا انجام ہوتا ہے۔ مجھے زندگی بہت پیاری ہے۔ ویسے بھی اس کے چہرے پر نقاب تھا۔"

"کسی مجرم کو شناخت کرنے کا مرحلہ ویسے بھی بڑا نازک ہوتا ہے۔" جج صاحب نے مربیانہ لہجے میں کہا۔ "میری کتاب میں ایسے کئی کیسوں کا حوالہ ملے گا جن میں مجرموں کو

شناخت کرنے میں گواہوں سے غلطی سرزد ہوئی۔ گواہوں نے ان لوگوں کو مثبت طور پر مجرموں کی حیثیت سے شناخت کیا جو بعد میں بے قصور ثابت ہوئے۔ ان میں سے بعض تو سزائیں بھی کاٹ چکے تھے۔"

"میں تو کسی ایسے مجرم کو بھی شناخت نہیں کرنا چاہوں گی جسے میں نے واضح طور پر دیکھا ہو۔" یاسمین نے کہا۔ "گزشتہ دنوں میری آنکھوں کے سامنے قتل کی ایک لرزہ خیز واردات ہوئی۔ میں نے قاتل کا چہرہ دیکھا لیکن میں سمجھتی ہوں کہ بے شمار لوگوں کے ایسے چہرے ہوں گے۔ اب میں صرف مشابہت کی بنیاد پر ان میں سے کسی کو شناخت کر بیٹھوں تو یہ میری حماقت ہوگی۔" اس کی نظریں بلاارادہ حارث کی طرف اٹھ گئیں۔ اسے یقین تھا کہ حارث نے اس کی بات سنی ہے لیکن وہ کسی اور طرف متوجہ ہو کر یہ ظاہر کر رہا تھا کہ اس نے کچھ نہیں سنا ہے۔

"لیکن بی بی' ایک اچھے شہری کے کچھ فرائض بھی ہوتے ہیں۔" جج شاکر علی نے پرُخیال انداز میں کہا۔ "بہرحال' یہ بھی ہے کہ اس قسم کی صورتِ حال میں آدمی الجھ جاتا ہے کہ کیا کرے اور کیا نہ کرے۔ تم کسی دن میرے کاٹیج میں آؤ' میں تمہیں اپنی کتاب کا مسودہ دکھاؤں گا۔ تم پڑھ کر دیکھنا کہ کیسے دلچسپ اور عجیب و غریب واقعات پیش آتے رہے ہیں۔"

"میں ضرور آؤں گی۔ شام کے وقت مجھے فرصت ہوگی۔" یاسمین نے کہا۔

مہمان رخصت ہونے لگے۔ عامر نے بڑے مہذب لہجے میں یاسمین سے کہا۔

"ارضیات بڑا دلچسپ مضمون ہے' اگر آپ ہفتے کی شام فارغ ہوں تو میرے ساتھ چلیں۔ میں یہاں چٹانوں کی ساخت پر ریسرچ کر رہا ہوں۔ کبھی کبھار بہت قیمتی پتھر بھی مل جاتے ہیں۔"

"ٹھیک ہے۔ بیگم شاہ نے ہفتے اور اتوار کی چھٹی کا وعدہ کیا ہے۔ ہفتے کو میں فارغ ہوں گی۔ میں ضرور چلوں گی آپ کے ساتھ۔"

"تم بھول رہی ہو سمی۔" عقب سے حارث کی آواز سنائی دی۔ لہجہ بے تکلفانہ تھا۔

"ہفتے کو تم میرے ساتھ سیر کو چلو گی' تم وعدہ کر چکی ہو۔"

یاسمین سناٹے میں آ گئی۔ ایسی کوئی بات نہیں ہوئی تھی مگر وہ تردید بھی نہ کر سکی۔

"کوئی بات نہیں پھر کسی دن سہی۔" عامر نے جلدی سے کہا۔ اس کا لہجہ دوستانہ تھا لیکن اس کی نظروں میں حارث کے لئے پسندیدگی نہیں تھی جو مسکرا رہا تھا۔

☆======☆======☆

صبح بیگم شاہ نے یاسمین کو اس کا دفتری کمرہ دکھایا۔ وہاں دفتری ضرورت کی ہر چیز موجود تھی پھر بیگم شاہ نے اسے کام کے متعلق سمجھایا۔ گھر کے تمام افراد کو ایک تقریب کے سلسلے میں کنٹری کلب جانا تھا۔ اب گھر پر صرف یاسمین اور ملازم رہ گئے تھے۔ یاسمین کام میں جت گئی جو بری طرح بکھرا ہوا تھا۔ کاغذات بے ترتیب تھے اور ان کی فائلنگ ہونا تھی۔

اچانک کوئی کمرے میں داخل ہوا۔ اونچی ہیل کی آواز سے اسے پتہ چل گیا کہ آنے والی کوئی لڑکی ہے۔ "کون ہو تم؟" ایک نسوانی آواز نے پوچھا۔

یاسمین نے پلٹ کر دیکھا۔ لڑکی سرو قامت اور حسین تھی۔ "میں یاسمین ہوں' بیگم شاہ کی سوشل سیکرٹری۔" اس نے کہا۔

"اوہ! نئی سیکرٹری' اب یا تو تم حارث کے چکر میں پڑ جاؤ گی یا حارث تمہارے چکر میں پڑ جائے گا۔ میرا نام ناصرہ ہے۔"

یاسمین کو اس کا لہجہ پسند نہیں آیا۔ اس نے سرد نگاہوں سے لڑکی کو گھورا پھر وہ بغیر کچھ کہے ٹائپ رائٹر پر جھک گئی۔ ناصرہ چلی گئی لیکن چند لمحے بعد وہ دوبارہ چلی آئی۔

"آؤ' ذرا میرا سامان رکھوا دو۔" اس نے یاسمین سے کہا۔

"کسی خادمہ سے مدد طلب کرو۔" یاسمین نے سرد لہجے میں کہا اور بدستور ٹائپ کرتی رہی۔

"سب کا یہی حال ہے۔ میں نے ایک خادمہ سے کہا تو وہ بولی' میں مصروف ہوں۔ کمبخت کو نوکری سے نکلوا دوں گی۔ پلیز یاسمین' میری مدد کرو۔" ناصرہ کا لہجہ التجائیہ ہو گیا۔

یاسمین کو اس کی بے بسی پر ترس آ گیا' وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ ناصرہ کے ساتھ کچھ دیر

گزار کر اسے اندازہ ہو گیا کہ وہ بے حد خودپسند اور مغرور لڑکی ہے۔ وہ کپڑوں کے' زیورات کے بارے میں لاف و گزاف کرتی رہی اور یاسمین بور ہوتی رہی۔ وہاں سے جان چھڑا کر وہ اپنے آفس میں آئی اور کام میں مصروف ہو گئی۔

☆------☆------☆

شام کو حارث کے سوا سب لوگ واپس آ گئے۔ بیگم شاہ نے کام کا جائزہ لیا اور بہت خوش ہوئیں۔ انہیں یاسمین کا فائلنگ سسٹم بہت پسند آیا۔ یاسمین چائے کے بعد لان میں چہل قدمی کے لئے نکلی تو وارث شاہ صاحب کو کرسی پر بیٹھے پایا۔ انہوں نے اشارے سے اسے بلایا اور اپنے برابر والی کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ یاسمین ان کی شخصیت سے بے حد متاثر تھی۔ ان کے انداز میں بلا کی شفقت تھی' وہ ان سے مکان کے بارے میں بات کرتی رہی۔ انہوں نے بتایا کہ یہ مکان ان کے دادا نے بنوایا تھا۔

"کسی دن تم میرا ذخیرہ بھی دیکھنا۔" شاہ صاحب نے بچگانہ لہجے میں کہا۔

"کاہے کا ذخیرہ؟"

"لکڑی کی مورتیوں کا بہت بڑا ذخیرہ ہے میرے پاس' بڑی بڑی نادر چیزیں ہیں ان میں۔"

"واہ! بہت اچھی ہابی ہے۔" یاسمین نے کہا۔ "دیکھوں گی کسی دن آپ کا ذخیرہ۔"

کچھ دیر بعد شاہ صاحب اندر چلے گئے۔ یاسمین گلاب کی روشوں کے پاس ٹہلنے لگی۔ اسے یہ سب کچھ بہت اچھا لگ رہا تھا' وہ دیر تک ٹہلتی رہی۔ سورج غروب ہو گیا' اندھیرا چھا گیا مگر اسے احساس ہی نہیں ہوا۔ بجری پر بچھے ہوئے راستے پر قدموں کی چاپ ابھری پھر اسے حارث کے گھونگھریالے بال نظر آئے۔ وہ گھر کی طرف جا رہا تھا لیکن اسے دیکھ کر اس کی طرف چلا آیا۔ "کہو' کیا حال ہے' کیسا دن گزرا؟" اس نے پوچھا۔

"ٹھیک ٹھاک۔ بہت لطف آیا مجھے۔" یاسمین نے جواب دیا۔

وہ اسے سفید سنگی بنچ کی طرف لے گیا۔ وہ دونوں بنچ پر بیٹھ گئے۔ اچانک حارث کو کھڑکی میں ناصرہ کی جھلک دکھائی دی۔ "اوہ! تو ناصرہ واپس آ گئی۔" اس نے کہا پھر یاسمین کا ہاتھ تھام کر بولا۔ "اسے منہ نہ لگانا' بہت بدتمیز ہے' فوراً تم پر سواری گانٹھنے لگے گی'

سب کے ساتھ ایسا ہی کرتی ہے' سوائے میرے۔"

یاسمین کچھ کہتے کہتے رہ گئی۔ ناصرہ اور حارث دونوں ایک دوسرے کو ناپسند کرتے تھے لیکن اس سے اس کا کیا تعلق؟ وہ تو یہاں کام کرنے آئی ہے' اسے اپنے کام سے کام رکھنا چاہئے۔

"یہ جگہ تو تمہیں دارالحکومت سے بہت مختلف لگی ہوگی؟" حارث نے پوچھا۔

"ہاں' یہاں ہوا میں تازگی کا احساس ہوتا ہے' بہت خوبصورت جگہ ہے یہ' صنعتی شہروں کی زندگی میں تو دھوئیں اور گرد کے سوا کچھ بھی نہیں ہوتا۔"

"اور وہ حادثہ؟ اتنی رات گئے تم کہاں سے آ رہی تھیں؟ میں اس حادثے کی بات کر رہا ہوں' جس کا تذکرہ تم جج شاکر علی سے کر رہی تھیں۔"

"الوداعی پارٹی سے واپس آ رہی تھی۔"

"تمہیں احتیاط برتنی چاہئے' لڑکیوں کو تنہا نہیں جانا چاہئے اور وہ بھی اتنی رات کو۔" حارث نے مربیانہ لہجے میں کہا۔ پھر جیسے وہ چونک گیا۔ "اوہ! اخبارات میں جس پُراسرار گواہ لڑکی کا تذکرہ تھا' وہ کہیں تم تو نہیں تھیں۔" اس نے یاسمین کو بہت غور سے دیکھا۔

"خیر' میری گواہی کی کوئی اہمیت نہیں تھی۔ میں پولیس کو کچھ زیادہ تو نہیں بتا سکی۔" یاسمین نے بے پروائی سے کہا۔

"بہت خوفناک تجربہ تھا' تم نے پولیس کو ڈرائیور کا حلیہ تو بتایا ہوگا۔ میرا خیال ہے' تم نے اسے بہت واضح طور پر دیکھا تھا۔"

"نہیں' اور میرا خیال ہے' اس جیسے بہت سے لوگ ہوں گے۔ اس کے خدوخال بہت عام سے تھے۔ میں نے رات بھی یہی کہا تھا کہ میں اسے شناخت نہیں کر سکتی۔"

خنکی بڑھ گئی تھی۔ یاسمین کو سردی لگنے لگی۔ اس نے اندر چلنے کو کہا۔ حارث نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ "ایسے نہیں' پہلے کل کا پروگرام طے کرو۔ کل تم میرے ساتھ کوہ پیمائی کرو۔ پہلے کی ہے کبھی؟" اس نے پوچھا۔

"نہیں لیکن جی بہت چاہتا ہے۔"

"بس تو ٹھیک ہے۔ کل صبح ہی نکل چلیں گے۔ کھانا ساتھ لے لیں گے۔ میں ممی سے اجازت لے لوں گا۔ ویسے بھی کل اور پرسوں تمہاری چھٹی ہے ہی۔" حارث نے کہا۔

وہ دونوں گھر کی طرف چل دیئے۔

اس رات بھی یاسمین اس ہولناک قتل کے بارے میں سوچتی رہی جس کی وہ عینی گواہ تھی۔ اسے حیرت تھی کہ وہ اس واقعے کو بھول کیوں نہیں جاتی' شاید اس لئے کہ حارث کا چہرہ مجھے قاتل ڈرائیور کی یاد دلاتا رہتا ہے۔ اس نے سوچا۔ حالانکہ ایسی کوئی بات نہیں' وہ ڈرائیور حارث نہیں تھا۔ ہو بھی نہیں سکتا۔ اتنی محبت کرنے والے ماں باپ.......... بے اندازہ دولت.......... نہیں' وہ نہیں ہو سکتا' لیکن وہ مجھے اس سلسلے میں کرید رہا تھا۔ اس نے اندازہ لگا لیا کہ اخبارات والی پُراسرار گواہ لڑکی میں ہی ہوں۔ وہ یہ اگلوانے کی کوشش کر رہا تھا کہ میں نے قاتل ڈرائیور کا چہرہ واضح طور پر دیکھا ہے اور اسے پہچان بھی سکتی ہوں۔ کیوں؟ شاید میری وجہ سے.......... شاید وہ مجھے پسند کرتا ہے' میں خود بھی اسے ناپسند نہیں کرتی۔ وہ بے وقوف' رومان پسند لڑکیوں کی طرح سوچتی رہی۔ بالآخر اسے نیند آ گئی۔

☆======☆======☆

اگلی صبح وہ کوہ پیمائی کی غرض سے نکل کھڑے ہوئے۔ یاسمین جینز اور ٹی شرٹ میں تھی اور پیروں میں ہلکے جوتے تھے۔ گھر سے وہ کار میں چلے تھے۔ پہاڑ کے دامن میں شاہ فیملی کا گیراج تھا۔ حارث نے کار گیراج میں کھڑی کر دی۔ اب انہیں پیدل چلنا تھا۔

انہوں نے چڑھائی کا سفر شروع کر دیا۔ حارث کنٹری بھی کرتا جا رہا تھا۔ پرندوں کی چہچہاہٹ سے فضا گونج رہی تھی۔ جیسے جیسے وہ اوپر چڑھتے رہے' راستہ دشوار تر ہوتا گیا اور اسی حساب سے ان کی رفتار کم ہوتی گئی۔ وقتاً فوقتاً وہ کسی پہاڑی چشمے کے قریب رکتے۔ ٹھنڈے پانی سے منہ ہاتھ دھوتے اور پانی پی کر تازہ دم ہو جاتے۔ پانی بے حد خوش ذائقہ اور فرحت بخش تھا۔ حارث نے بتایا کہ یہ ان جڑی بوٹیوں کا کمال ہے' جن سے پہاڑی چشمے گزرتے ہوئے فیض اٹھاتے ہیں۔

"کھانا کب کھائیں گے ہم؟" یاسمین نے آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ سورج اب سر پر آ پہنچا تھا۔

"ابھی لو' تم نے مناسب ترین مقام پر کھانے کی فرمائش کی ہے۔" حارث نے کہا اور چھجے کی طرح پھیلی ہوئی چٹان کی طرف بڑھ گیا' جس کے نیچے خنک سایہ تھا۔ قریب ہی ایک چشمہ بہہ رہا تھا۔

کھانے کے بعد انھوں نے چڑھائی کا سفر جاری رکھا۔ کچھ دیر بعد حارث نے کہا۔ "اب ہمیں واپس چلنا ہوگا۔ اس ہائکنگ کے اثرات کل ظاہر ہوں گے' جسم کا جوڑ جوڑ دُکھے گا۔"

"ٹھیک ہے۔" یاسمین نے کہا۔ "میں تھک بھی گئی ہوں لیکن میں واپسی سے پہلے کچھ پہاڑی پھول جمع کرنا چاہتی ہوں۔"

وہ پھول جمع کرنے میں مصروف ہو گئی پھر اسے ایک چٹان پر خوبصورت گلابی پھول نظر آئے۔ وہ بے اختیار بڑھی اور چٹان پر چڑھ گئی۔ چٹان کے نیچے شاید کوئی پہاڑی چشمہ تھا جس کی وجہ سے چٹان پھسلواں ہو گئی تھی۔ نیچے سینکڑوں فٹ گہری مہیب کھائی تھی۔ پھولوں کا پودا چٹان کے آخری سرے پر تھا۔

"احتیاط سے۔" عقب سے حارث نے چیخ کر کہا۔ پھر یاسمین نے اس کے لپکتے قدموں کی آواز سنی۔ وہ بے حد احتیاط سے آگے بڑھتی رہی۔ "بے وقوف.......... یہ چٹان پھسلواں ہے۔" حارث نے کہا اور پیچھے سے اس کا سوئٹر تھاما لیکن اگلے ہی لمحے یاسمین نے محسوس کیا کہ اس کا سوئٹر حارث کے ہاتھ سے نکل گیا ہے۔ نہ صرف یہ بلکہ وہ بھی توازن کھو بیٹھی ہے۔ وہ پھسلی اور پھر اس نے خود کو خلا میں محسوس کیا۔ وہ گر رہی تھی۔ اس نے ہاتھ چلائے اور چٹان پر اُگے ہوئے سبزے کو گرفت میں لینے کی کوشش کی لیکن بے سود۔ اس کے پھسلنے کی رفتار بڑھ رہی تھی پھر اچانک اسے ایک جھٹکا لگا۔ وہ دیوار کے ایک درخت سے ٹکرائی تھی۔ درخت سے پھسلتے ہوئے اسے احساس ہوا کہ اس کا داہنا ہاتھ درخت کے تنے سے لپٹ گیا ہے۔ اسی چیز نے اسے پوری طرح گرنے سے بچا لیا۔ درخت کی جڑ تک پہنچ کر اسے ایک اور جھٹکا لگا۔ اگر اس کے اوسان ٹھکانے نہ

ہو۔ تو ہاتھ کی وہ گرفت بھی جاتی رہتی لیکن اس کا بایاں ہاتھ اپنے جسم اور چٹان کے درمیان دب کر رہ گیا تھا۔ [illegible] کھڑا تھا اسے اپنے بائیں ہاتھ میں [illegible] شدید درد محسوس ہوئی لیکن اس نے اپنی توجہ دائیں ہاتھ پر مرکوز رکھی جو [illegible] گرد لپٹا ہوا تھا۔ وہ خوف کے مارے بالکل ساکت ہو گئی۔

وہ اسی بے تکی پوزیشن میں لٹکی رہی۔ سامنے ہی پہاڑ [illegible] اس پر سے وہ اور حارث ہو کر گزری تھی پھر اسے حارث نظر آیا۔ وہ اس کے قریب آیا [illegible] [illegible] سکوں گا۔ تم تھوڑی دیر خود کو بچائے رکھو۔ میں پہاڑی لوگوں کو مدد کے لئے [illegible] کر ابھی آیا۔" یہ کہہ کر وہ پلٹ گیا۔

یاسمین نے اس کے چہرے پر [illegible] دیکھا۔ صاف اور شفاف [illegible] [illegible] چہرے پر [illegible] واسطے ذرا دیر کے چہرے پر...... لیکن یہ کیسے ممکن تھا۔ شاید یہ اس کی نگاہوں کے زاویے کا کرشمہ تھا ورنہ حارث کے لہجے میں تو فکرمندی تھی، تشویش تھی...... محبت آمیز تشویش اور پھر اس نے تو اس کا سویٹر تھام کر اسے سنبھالنے کی کوشش کی تھی یہ سنبھالنے کی یا گرانے کی؟ کیونکہ یاسمین کو ایسا لگا تھا جیسے حارث نے اسے آگے کو دھکیلا ہو۔ لیکن یہ بھی اس کا وہم ہی تھا۔ حارث نے اس کا سویٹر تھاما تھا لیکن فوراً ہی وہ اس کے ہاتھ سے پھسل گیا تھا۔ پھسل گیا تھا یا اس نے دانستہ چھوڑ دیا تھا؟ وہ یہ فیصلہ نہیں کر سکتی تھی کہ وہ حارث کے سنبھالنے کی کوشش سے پہلے پھسلی تھی یا بعد میں۔ پھر اس نے سوچا کہ یہ ان احمقانہ باتوں پر سوچنے کا وقت نہیں۔ اسے خود کو ساکت رکھنے پر توجہ دینی چاہئے۔

یا تو وقت بہت سست رفتاری سے گزر رہا تھا...... یا حارث کو گئے بہت دیر ہو گئی تھی۔ کون سی بات درست تھی، کون سی بات غلط تھی، یہ فیصلہ کرنا اس کے لئے ممکن نہیں تھا۔ جسم کے نیچے دبا ہوا اس کا بایاں ہاتھ بری طرح دکھ رہا تھا۔ اس نے سوچا کہ پہلو بدل کر اسے باہر نکال لے لیکن اس صورت میں دائیں ہاتھ کی گرفت ہلکی ہونے کا خطرہ تھا اور نیچے بہت گہری کھائی تھی جس کا وہ تصور ہی کر کے دہل گئی۔ نیچے دیکھنے کا تو سوال

ہی نہیں تھا۔ پہاڑوں کا سرمہ [illegible] کے مقابلے میں [illegible] ہاتھ [illegible] تھی۔ چنانچہ اس نے دم سادھ لیا۔

اچانک بارش شروع ہو گئی۔ [illegible] تھا۔ خود کو ساکت رکھنا دشوار ہو [illegible] اس کا جسم لرز رہا تھا [illegible] سے لپٹا ہوا اس کا دایاں ہاتھ [illegible] اس کے جسم کا اہم ترین حصہ تھا۔ [illegible] اس نے [illegible] کہ حارث کہیں [illegible]

بارش رک گئی [illegible] لیکن اب وہ ٹھٹھر رہی تھی۔ [illegible] تھی۔ اپنے آشیانوں کی طرف [illegible] کہ شام ہو چکی [illegible] سورج غروب [illegible] سے اس کے پورے جسم میں اینٹھن سی ہو رہی تھی۔ وہ سوچ رہی تھی کہ اس پوزیشن میں کب تک رہ سکتی ہے۔ بالآخر اسے یہ پوزیشن [illegible] پھر اسے [illegible] اگر وہ اسی عالم میں بے ہوش ہو گئی تو نیچا ہو گا۔ نیچے گرنے کا تصور ہی جان لیوا تھا۔

ایسے میں کچھ آوازیں سنائی دیں تو اس نے انہیں فریب سماعت قرار دے کر مسترد کر دیا لیکن آوازیں قریب آتی محسوس ہوئیں پھر اسے پہاڑی راستے پر کچھ لڑکیاں نظر آئیں۔ وہ گاگروں میں پانی بھر کے واپس جا رہی تھیں۔ اس نے جسم و جان کی پوری قوت سے انہیں پکارا۔ "مدد...... میری مدد کرو۔" لیکن اس کی آواز کراہ سے زیادہ بلند نہیں تھی۔

لڑکیوں تک اس کی آواز پہنچ گئی۔ پھر ایک لڑکی نے اسے دیکھا۔ چند لمحے بعد تمام لڑکیاں اس کے قریب آئیں۔ "اوہ! مضبوطی سے پکڑے رہو۔" ایک لڑکی نے پکارا۔ "ہم ابھی مدد لے کر آتے ہیں۔"

پھر وہ لڑکیاں بھی حارث کی طرح چلی گئیں۔ اب یاسمین کو آنکھیں کھلی رکھنا دوبھر

ہو رہا تھا۔ تھکن اس کے رگ و پے میں سرایت کر گئی تھی۔ جسم کے نیچے دبا ہوا بایاں ہاتھ اب پوری طرح سن ہو گیا تھا۔ اب تو وہ چاہتی بھی تو پوزیشن نہیں بدل سکتی تھی۔ ذہن اندھیروں میں ڈوبتا جا رہا تھا۔

اچانک اسے حرارت کا احساس ہوا۔ وہ کمبل میں لپٹی ہوئی تھی۔ "کیا تم اکیلی تھیں؟" ایک مردانہ آواز نے پوچھا۔

"نہیں، حارث مدد لینے کے لئے گئے تھے۔" اس نے آنکھیں کھولے بغیر جواب دیا۔ اس کے بعد ذہن میں پھر تاریکی چھا گئی۔

دو گھنٹے بعد اس نے آنکھیں کھولیں تو اسے حارث کی صورت نظر آئی۔ اس کے سر پر پٹی بندھی ہوئی تھی۔ "حارث! تم زخمی ہو؟" اس نے پوچھا۔

"ہاں لیکن تم سکون سے لیٹی رہو۔"

وہ اس کے احتجاج کے باوجود اٹھ بیٹھی۔ اس کا بند بند دکھ رہا تھا۔ "کیا ہوا؟"

"کچھ نہیں، میرا بھی پاؤں پھسل گیا تھا، چوٹ زیادہ نہیں آئی لیکن میں چار پانچ گھنٹے بے ہوش رہا ہوں۔ تمہارے بتانے پر ان پہاڑی لوگوں نے مجھے بھی تلاش کیا۔ میں تمہارا شکرگزار ہوں۔"

"خدا کا شکر ہے۔"

"ہمیں یہاں شب بسری کرنی پڑے گی۔ ہم اس وقت پہاڑی لوگوں کے درمیان ہیں۔ میں برابر والی جھونپڑی میں ہوں۔"

اسی وقت ایک پہاڑی ان کے لئے کھانا لے آیا۔ کھانا کھاتے ہی یاسمین کو نیند آ گئی۔

☆======☆======☆

اگلی صبح انہوں نے واپسی کا سفر شروع کر دیا۔ حارث تمام راستے اس سے معذرت کرتا رہا.......... اپنی غیر ذمے داری پر.......... اور وہ بڑے خلوص سے اسے یقین دلاتی رہی کہ اس میں اس کا کوئی قصور نہیں تھا لیکن وہ سوچتی رہی کہ کیا واقعی حارث نے اسے سنبھالنے کی کوشش کی تھی یا اسے دھکیلا تھا۔ پھر اسے اپنی اس رکیک سوچ پر غصہ آ گیا۔

حارث نے تو اسے وہ پھول توڑنے کو نہیں کہا تھا جو اس چٹان کے آخری سرے پر کھلے ہوئے تھے اور وہ چٹان خطرناک بھی تھی۔ پھر اسے حارث کے چہرے کے وہ خوفناک تاثرات یاد آ گئے۔ وہ سوچتی اور الجھتی رہی۔

راستے میں وہ آرام کرنے کے لئے رکے اور ایک چٹان سے پیٹھ لگا کر بیٹھ گئے۔

حارث نے اپنی جیب سے ایک لفافہ نکالا اور یاسمین کی طرف بڑھا دیا۔ یاسمین نے اسے کھول کر دیکھا اور حیران رہ گئی۔ وہ ایک خوبصورت انگوٹھی تھی۔ حارث نے انگوٹھی اس سے لے لی اور بولا۔ "لاؤ اپنا ہاتھ، میں خود پہناؤں گا۔"

"یہ بہت قیمتی معلوم ہوتی ہے۔ میں نہیں لوں گی یہ انگوٹھی۔"

"کیوں نہیں لو گی، میں جو دے رہا ہوں تمہیں۔" حارث نے سخت لہجے میں کہا۔

یاسمین نے انگوٹھی لے لی اور اسے بغور دیکھا۔ وہ نیلم تھا۔ اردگرد چھوٹے چھوٹے ہیرے جڑے ہوئے تھے۔ "بہت خوبصورت انگوٹھی ہے۔" اس نے کہا۔

"یہ میری خاندانی انگوٹھی ہے، میں چاہتا ہوں کہ تم اسے پہنو۔"

"ٹھیک ہے، میں اس میں زنجیر ڈلواؤں گی اور اسے بطور لاکٹ استعمال کروں گی۔"

"یہ اور بھی اچھا ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ کوئی بھی اس انگوٹھی کو تمہارے پاس دیکھے۔ ایسی چیزوں کے لئے تو لوگ قتل بھی کر دیئے جاتے ہیں۔"

"پلیز مجھے ڈراؤ مت۔" یاسمین نے کہا اور اس کا جسم لرز اٹھا۔

☆=====☆=====☆

"حارث پھر چلا گیا ہے۔" بیگم شاہ نے کہا۔ "میں اس لڑکے کے کاروباری دوروں سے تنگ آ گئی ہوں، گھر میں مہمانوں کی طرح رہتا ہے۔"

یاسمین نے کاروبار کی نوعیت کے بارے میں سوال کرنا ضروری نہ سمجھا۔

لیکن بیگم شاہ نے خود ہی وضاحت کر دی۔ ان کا لہجہ فخریہ تھا۔ "وہ سرمایہ کاری کرتا ہے۔ بے حد ذہین لڑکا ہے، کاروبار میں بے حد کامیاب ہے۔ میرے شوہر نے بہت کوشش کی کہ وہ ان کی فرم میں کام کرے، ان کا ہاتھ بٹائے لیکن اس کے مزاج میں خودمختاری ہے۔ اس نے ہم سے کبھی مدد نہیں لی۔ کتنی بڑی بات ہے۔ کوئی دوسرا لڑکا ہوتا تو کچھ

کرنے کے بجائے دولت اڑانا۔ خیر......" وہ ایک گہری سانس لے کر بولیں۔ "یاسمین...... اس ہفتے میں بہت مصروف ہوں۔ تمہارے پاس میرا پورا شیڈول ہے نا؟"

"جی ہاں۔"

یہ گفتگو ناشتے کی میز پر ہوئی تھی۔ یاسمین ناشتے سے فارغ ہو کر اپنے آفس روم میں آ گئی۔ کچھ دیر بعد فون کی گھنٹی بجی۔ یاسمین نے ریسیور اٹھایا۔ دوسری طرف جج شاکر علی تھے۔

"تم کب آ رہی ہو؟ میں اپنی کتاب کے متعلق تم سے بات کرنا چاہتا ہوں۔"

یاسمین نے ان سے آنے کا وعدہ کر لیا اور وعدہ وفا کرنے کا موقع اسے چار دن بعد ملا۔ ان چار دنوں میں کام کا دباؤ بہت زیادہ تھا۔ بیگم شاہ نے کام بہت پھیلا رکھے تھے۔ سینکڑوں رفاہی اداروں کو ماہانہ امداد...... پھر رفاہی تقریبات اور اس پر ان کی سوشل معروفیات۔ بہرحال' چار دن میں یاسمین نے پچھلا تمام کام نمٹا دیا۔ بیگم شاہ اس کی کارکردگی سے بے حد خوش تھیں۔

وہ جنگل کے راستے جج کے کاٹیج تک پہنچی۔ کاٹیج کے آس پاس دور تک کوئی مکان نہیں تھا۔ کاٹیج بے حد خوبصورت تھا۔ جج صاحب نے اسے آتے دیکھ لیا تھا۔ انہوں نے دروازے پر اس کا استقبال کیا۔ یاسمین سحرزدہ سی کاٹیج کو دیکھتی رہی۔

"اس کا ڈیزائن میں نے خود تیار کیا تھا۔" جج صاحب نے فخریہ لہجے میں بتایا۔ "اس میں تین کمرے ہیں۔ صفائی کے لئے ایک خادمہ ہفتے میں دو بار آتی ہے۔ کبھی کبھار جب مہمان آئے ہوئے ہوں تو کھانا بھی پکا دیتی ہے ورنہ بیشتر اوقات کھانا میں خود ہی پکاتا ہوں اور بہت زوردار پکاتا ہوں۔"

"کسی دن اس کا تجربہ بھی ہو جائے گا۔" یاسمین نے خوشدلی سے کہا۔

"یہ تو ہے' فی الحال کافی سے کام چلاؤ۔"

کچھ ہی دیر بعد وہ کاٹیج کی بیٹھک میں بیٹھے کافی کے گھونٹ لے رہے تھے۔ پھر مجرموں کی غلط شناخت کی بات چل نکلی۔ جج صاحب نے اس سلسلے میں اپنے کئی تجربات سنا

ڈالے۔ "دشواری یہ ہے کہ ہر پولیس افسر محض یہ ثابت کرنے کی کوشش کرتا ہے کہ ملزم ہی نے جرم کیا ہے۔ اس سمت میں کوئی نہیں سوچتا کہ الزام غلط بھی ہو سکتا ہے اور یہ [illegible] خامی ہے۔" جج صاحب نے اپنا مسودہ اٹھایا' اس کی ورق گردانی کی اور پھر بولے۔ "اب یہ کیس دیکھو' دو افراد [illegible] میں گرفتار ہوئے جس کے دوران [illegible] ہوئی تھی اور ایک شخص مارا گیا تھا۔ [illegible] کے خلاف سماعت شروع ہونے والی تھی۔ استغاثہ کا کیس شناختوں کی وجہ سے بے حد مضبوط ہو گیا تھا۔ [illegible] کو جس وقت گرفتار کیا گیا تو ان [illegible] ریوالور بھی تھے لیکن [illegible] ریوالور نہیں تھا جس سے [illegible] دوران مقتول کو شوٹ کیا گیا تھا۔ بہرحال' یہ فرض [illegible] دو ریوالور انہوں نے واردات کے فوراً بعد ادھر ادھر کر دیا ہو گا۔

"پھر ہوا یہ کہ مقدمے کی سماعت شروع ہو گئی۔ ادھر ایک اور واردات کے دوران دو مجرم [illegible] پکڑے گئے۔ [illegible] انہوں نے [illegible] کا اعتراف [illegible] کیا [illegible] جس واردات کا مقدمہ پہلے ہی چل رہا تھا' گرفتار شدگان میں سے ایک کے پاس وہ ریوالور موجود تھا جس سے مقتول کو شوٹ کیا گیا تھا۔ شناخت کرنے والوں کے سامنے نئے مجرموں کو لایا گیا۔ انہوں نے انہیں بھی شناخت کر لیا۔ درحقیقت ان کے درمیان مشابہت بہت زیادہ تھی۔ واردات رات کے وقت ہوئی تھی' اس لئے گواہ دھوکا کھا گئے۔"

"اور اگر اصل مجرم اتفاقاً گرفتار نہ ہوتے تو کیا ہوتا؟" یاسمین نے پوچھا۔

"وہ دونوں بے قصور یقیناً سزا پاتے۔" جج صاحب نے کندھے جھٹکتے ہوئے کہا۔ "ایسا کئی بار ہو چکا ہے۔"

"میں آپ کی کتاب میں بہت زیادہ دلچسپی محسوس کر رہی ہوں' یہ کب تک چھپ جائے گی؟"

"یہ یقین سے نہیں کہا جا سکتا۔ کتاب انگریزی میں ہے' پہلے تو مجھے اسے ٹائپ کروانا ہو گا۔"

"ٹائپ میں کر دوں گی' شام کو تو مجھے فرصت ہوتی ہے۔"

"نہیں' یہ تمہارے ساتھ زیادتی ہوگی۔ دن بھر ٹائپ کرنے کے بعد آرام کے بجائے پھر ٹائپنگ........"

"ایسی کوئی بات نہیں انکل' یہ میری تفریح ہوگی۔ درحقیقت مجھے اس موضوع سے بے حد دلچسپی ہے۔"

"میں تمہارا شکرگزار ہوں گا لڑکی۔" جج صاحب نے بے حد اپنائیت سے کہا۔

یاسمین کالج سے نکل رہی تھی کہ عامر کی کار آ کر رکی۔ عامر کار سے اترا اور یاسمین کو دیکھ کر مسکرایا۔ "آؤ' میں تمہیں شاہ پیلس چھوڑ دوں۔" اس نے یاسمین سے کہا۔

یاسمین کار میں بیٹھ گئی۔ عامر ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھا اور اس نے گاڑی آگے بڑھا دی۔

"انکل کی کتاب میں دلچسپی لے رہی ہو نا؟" اس نے پوچھا۔ یاسمین نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ "لیکن تمہیں کسی دن میرے ساتھ پتھروں کی تلاش میں نکلنے کے لئے بھی وقت دینا ہوگا' سمجھیں۔"

"ٹھیک ہے۔"

عامر نے اسے دروازے پر ڈراپ کیا' وہ اندر داخل ہو گئی۔ اچانک ایک طرف سے حارث اس کے سامنے آ گیا' وہ گھبرا گئی۔ "اوہ حارث! تم نے تو مجھے ڈرا ہی دیا۔" اس نے شکایتی لہجے میں کہا۔

"لگتا ہے' میری عدم موجودگی میں عامر سے کچھ زیادہ ہی بے تکلف ہو گئی ہو۔" حارث نے زہریلے لہجے میں کہا۔

"تو کیا ہوا؟"

"میں یہ برداشت نہیں کر سکتا۔" حارث نے سختی سے اس کا ہاتھ تھامتے ہوئے کہا۔

یاسمین نے ایک جھٹکے سے اپنا ہاتھ چھڑا لیا۔ "کیا مطلب ہے تمہارا! کیا میں تمہاری پابند ہوں۔" اس کی آواز غصے سے لرز رہی تھی۔

"سوری سمی۔" حارث کا لہجہ بدل گیا۔ "میں طبعاً حاسد ہوں' میں تمہیں کسی سے پینگیں بڑھاتے نہیں دیکھ سکتا اور خاص طور پر........"

"اپنی زبان کا خیال رکھو مسٹر حارث۔" یاسمین نے سخت لہجے میں کہا۔ "اطلاعاً

عرض ہے کہ میں کسی سے پینگیں نہیں بڑھا رہی ہوں اور دوسری بات یہ کہ مجھے تمہارے سامنے صفائی پیش کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔" یہ کہہ کر وہ اس کی طرف دیکھے بغیر آگے بڑھ گئی۔ اسے حارث کی نامعقولیت پر طیش آ رہا تھا پھر اسے خیال آیا کہ کہیں حارث نے اسے اپنی محبت سے متاثر کرنے کے لئے رقابت کا ڈھونگ تو نہیں رچایا لیکن سوال یہ تھا کہ وہ اس سے محبت کیوں کرنے لگا۔ اس کے لئے لڑکیوں کی کمی تو نہیں لیکن پھر وہ انگوٹھی.......... اس نے انگوٹھی کو بڑے غور سے دیکھا۔ وہ یقیناً قیمتی انگوٹھی تھی۔ یاسمین نے فیصلہ کیا کہ بڑی نرمی سے.......... حارث کو تکلیف پہنچائے بغیر وہ انگوٹھی اسے واپس کر دے گی۔ اسے اس بات کا خیال رکھنا ہوگا کہ حارث غصے کا بہت تیز ہے اور وہ اس کے غصے سے خوفزدہ تھی۔

☆======☆======☆

مقامی میلے کا دن جیسے جیسے قریب آ رہا تھا' یاسمین کی مصروفیات اور کام بڑھتا جا رہا تھا۔ اس دن دوپہر کے کھانے پر باتوں کے دوران بیگم شاہ نے انکشاف کیا کہ ان کے تمام مسروقہ زیورات برآمد ہو گئے ہیں' سوائے نیلم کی اس انگوٹھی کے' جس کے گرد چھوٹے چھوٹے ہیرے جڑے ہوئے ہیں۔ یاسمین یہ سن کر بری طرح چونکی۔

حارث نے غیر محسوس طور پر گفتگو کا رخ بدل دیا۔ "ممی! یہ بتائیں' میلے کے سلسلے میں آپ کا کیا پروگرام ہے؟"

"پروگرام تو بہت سے ہیں لیکن میں سوچ رہی ہوں کہ جرائم کے سلسلے میں جج شاکر علی کا لیکچر بھی رکھا جائے۔"

"گڈ!" حارث نے کہا۔ اس کی نظریں یاسمین کے گلے کی زنجیر پر جمی ہوئی تھیں۔

"سمی! اس زنجیر کے ساتھ کون سی قیمتی چیز ہے' ہمیں نہیں دکھاؤ گی؟" اس نے اچانک ہی یاسمین کو مخاطب کیا۔

یاسمین کا چہرہ تمتما اٹھا۔ تاہم اس نے بے حد ٹھہرے ہوئے اور طنزیہ لہجے میں کہا۔

"بے حد عام اور غیر اہم سی چیز ہے۔" حارث کے چہرے پر پھیلتی تاریکی کو دیکھ کر اسے خوشی ہوئی۔

اس سے پہلے وہ عامر کے ساتھ پتھروں کی تلاش میں نکلی۔ اس کا وقت بہت اچھا گزرا لیکن جاتے وقت اس کا سامنا حارث سے ہو گیا۔

"میرا خیال ہے' مجھے یہ پوچھنے کا حق نہیں کہ تم کہاں اور کس کے ساتھ جا رہی ہو؟" حارث نے سخت لہجے میں کہا۔

"میں عامر کے ساتھ جا رہی ہوں' ہم لوگ قیمتی پتھر تلاش کریں گے۔" یاسمین نے سنسنی آمیز لہجے میں کہا۔

"قیمتی اور اس سے بہتر جواہرات حاصل کرنے کے اور طریقے بھی ہیں جو نسبتاً آسان بھی ہیں۔"

"تمہارا اشارہ شاید چوری کی طرف ہے۔" یاسمین نے بے ساختہ کہا اور پشیمان ہو گئی کیونکہ حارث کا چہرہ سپید پڑ گیا تھا۔ "میں مذاق کر رہی تھی۔ پھر ملیں گے۔" یاسمین نے کہا اور آگے بڑھ گئی۔ وہ راستے میں سوچتی رہی کہ اس نے جواہرات کے سلسلے میں چوری کی بات کیوں چھیڑی۔ شاید اس لئے کہ اسے حارث کی دی ہوئی انگوٹھی اور بیگم شاہ کی مسروقہ انگوٹھی میں کوئی قدرِ مشترک محسوس ہوئی تھی۔

لیکن عامر سے مل کر وہ سب کچھ بھول گئی۔ عامر کے کندھے سے کینوس کا بیگ لٹک رہا تھا۔ اس نے خاص قسم کی بیلٹ کمر سے باندھی ہوئی تھی۔ "تم تو پوری تیاری سے نکلے ہو۔" یاسمین نے کہا۔

"ماہرین ارضیات کے لئے یہ ضروری ہوتا ہے۔" عامر نے فخریہ لہجے میں کہا۔

وہ بہت بڑے بڑے پتھروں کے درمیان پھرتے رہے۔ "یہ شمالی علاقے کی چٹانیں ہیں۔" عامر نے وضاحت کی۔ "بڑے بڑے گلیشیر ان چٹانوں کو اس طرف لڑھکا دیتے ہیں۔" راستے میں وہ جگہ جگہ رک کر چٹانوں کا اپنے خوردبینی آلات سے جائزہ لیتا رہا اور ان پر تبصرے کرتا رہا۔ "یہ جو بڑی بڑی چٹانوں پر گومڑے سے ہیں نا' یہ نامڑا ہے۔"

یاسمین جھک کر دیکھنے لگی۔ اس کی گلے کی زنجیر باہر نکل آئی اور جھولنے لگی۔

یاسمین جلدی سے پیچھے ہٹی اور اس نے انگوٹھی کو چھپا لیا۔

"یہ کیا ہے' منگنی کی انگوٹھی؟" عامر نے پوچھا۔

"نہیں' ایسی تو کوئی بات نہیں۔"

"ذرا مجھے دکھاؤ۔ تمہیں معلوم ہے' مجھے پتھروں سے دلچسپی ہے۔"

"نہیں' میں نہیں دکھا سکتی۔" یاسمین نے معذرت خواہانہ لہجے میں کہا۔ "اس سلسلے میں' میں بہت وہمی ہوں' میں کسی اجنبی کو یہ انگوٹھی کبھی نہیں دکھاتی۔"

"اور جب اجنبی دوست بن جائیں تب؟"

"دیکھیں گے۔" یاسمین نروس ہونے لگی۔ وہ پھر چٹان پر جھک گئی' جہاں سرخ رنگ کا گومڑ سا ابھرا ہوا تھا۔ وہ واقعی نامڑا تھا۔

"یہ پتھر تمہارے نیلم اور ہیروں جیسے قیمتی نہیں ہیں۔" عامر نے کہا۔

یاسمین سوچ میں پڑ گئی۔ عامر نے یقیناً انگوٹھی کو پوری طرح دیکھ لیا تھا۔ اب اسے پتھروں کی تلاش میں بھی دلچسپی محسوس نہیں ہو رہی تھی۔ وہ جلد از جلد واپس جانا چاہتی تھی۔ کم از کم وہ اب قیمتی پتھروں کے موضوع پر گفتگو نہیں کرنا چاہتی تھی۔ چنانچہ اس نے موضوع بدلا۔ "میں اب تھک گئی ہوں' کہیں ستانے کی جگہ تلاش کر کے بیٹھتے ہیں۔ پھر تم مجھے آثارِ قدیمہ کے متعلق بتانا۔"

عامر نے اسے عجیب سی نظروں سے دیکھا۔ "آثارِ قدیمہ کو چھوڑو' میں تمہارے متعلق بات کرنا چاہتا ہوں۔ میرے خیال میں تم خمس صدی پرانی ہو۔" اس نے کہا۔

یاسمین کو ہنسی آ گئی۔ "تمہارا اندازہ غلط ہے' میں چوتھائی صدی پرانی ہوں۔"

"اوہ.......... اور میں صرف انتیس سال کا ہوں۔ خیر' یہ بتاؤ کیا تم حارث کو یہاں آنے سے پہلے سے جانتی ہو؟"

"یہ کیوں پوچھ رہے ہو تم؟"

"اس لئے کہ وہ تمہیں ایسی نظروں سے دیکھتا ہے جیسے پہلے سے تم دونوں کی جان پہچان ہو۔"

"تمہیں وہم ہوا ہے۔ میں حارث سے پہلی بار اس دن ملی ہوں' جب شاہ پیلس آئی تھی۔"

"یہ بھی بہت ہے۔ حارث سے اتنی شناسائی بھی کم نہیں۔"

"کیوں، کیا مطلب؟ یہ بات کیوں کہی تم نے؟"

"بلاارادہ کہہ گیا ہوں۔" عامر نے جلدی سے صفائی پیش کی۔ "میں اس شخص کو ذرا بھی پسند نہیں کرتا ہوں۔"

یاسمین ہنسنے لگی۔ "گویا دونوں طرف ہے آگ برابر لگی ہوئی، وہ بھی تمہیں پسند نہیں کرتا۔"

"خیر چھوڑو، تم مجھے اپنے بارے میں بتاؤ، تم کیا پسند کرتی ہو اور کیا ناپسند۔ تم کھانا کیسا پکاتی ہو؟ تمہیں شاعری اچھی لگتی ہے؟"

"ایک منٹ، پہلے مجھے ایک سوال پوچھنا ہے۔ یہ بتاؤ، اس ملک میں ایک جیالوجسٹ کا مستقبل کیسا ہوتا ہے؟" یاسمین نے پوچھا۔

"ہاں، یہ سوال مجھے پسند آیا۔ جب کوئی لڑکی کسی مرد سے ایسا سوال پوچھتی ہے تو اس کا مطلب ہوتا ہے کہ وہ اسے پسند کرتی ہے۔"

یاسمین نے اس کی طرف پتھر اچھالا۔ اگلے ہی لمحے وہ دونوں بچوں کی طرح بھاگ رہے تھے۔ عامر آگے آگے تھا اور یاسمین پیچھے پیچھے، پھر وہ تھک گئے اور ایک ہی پتھر سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئے۔ دیر تک وہ ایک دوسرے کو اپنے بارے میں بتاتے رہے۔

☆======☆======☆

یاسمین واپس آئی تو لائبریری کا دروازہ کھلا دیکھا۔ حارث میز پر اخبار پھیلائے اس پر جھکا کھڑا تھا۔ یاسمین نے ذرا ہٹ کر جھانکا تو پتہ چلا کہ وہ اخبار سے کوئی تراشا نکال رہا ہے۔ یاسمین نے اسے پکارا تو اس نے تراشا تہہ کئے بغیر ہی اپنی پتلون کی جیب میں ٹھونس لیا۔

"تو تمہیں تراشے جمع کرنے کا شوق بھی ہے؟" یاسمین نے مذاقاً پوچھا اور فوراً ہی شرمندہ ہو گئی۔ کیونکہ حارث کا چہرہ زرد پڑ گیا تھا۔

"میرے مطلب کی کاروباری خبر تھی۔" حارث نے صفائی پیش کی۔ "دراصل میں سرمایہ کاری کرتا ہوں۔"

یاسمین اپنے کمرے میں چلی گئی۔ وہ سوچ رہی تھی کہ حارث اس بری طرح کیوں چونکا تھا۔

کچھ دیر بعد شاہ صاحب نے شکایت کی کہ کسی نے دارالحکومت کے اخبار سے وہ خبر کاٹ لی ہے، جس میں وہ دلچسپی لے رہے تھے۔ اس وقت حارث بھی کمرے میں موجود تھا۔ یاسمین کو توقع تھی کہ وہ جیب سے اخبار کا تراشا نکال کر شاہ صاحب کی طرف بڑھا دے گا لیکن حارث نے تو جیسے شاہ صاحب کی بات سنی ہی نہیں۔ اب یاسمین کی اس تراشے میں دلچسپی اور بڑھ گئی۔

اگلی صبح یاسمین کو مقامی میلے کے سلسلے میں چندہ طلب کرنے کے لئے التجائی خطوط کا ڈھیر پوسٹ کرنا تھا۔ اس نے ایک خط دارالحکومت کے اس اخبار کے مقامی ایجنٹ کے نام بھی پوسٹ کر دیا، جس میں اس نے گذشتہ روز کے اخبار کا ایک شمارہ طلب کیا تھا۔

جیسے جیسے میلے کی تاریخ قریب آ رہی تھی' یاسمین کی مصروفیات بڑھتی جا رہی تھیں۔ ایک دن عامر آفس روم میں اس کا ہاتھ بٹا رہا تھا کہ سیلانی ناصرہ نازل ہو گئی۔ عامر سے وہ اس کی پہلی ملاقات تھی۔ ناصرہ نے فوراً ہی کمبل ہونے کی کوشش کی لیکن عامر نے اسے ٹال دیا۔ وہ چیں بہ جبیں ہوئی لیکن خاموشی سے چلی گئی۔ یاسمین کو احساس ہو گیا کہ وہ بدلہ لینے کی کوشش ضرور کرے گی۔

ہوا بھی یہی۔ میلے والے دن ناصرہ' عامر کو لے اڑی۔ اس میں اداس ہونے کی کوئی بات نہیں تھی لیکن یاسمین پھر بھی اداس تھی۔ وہ مہمانوں کے ہجوم میں خود کو تنہا محسوس کر رہی تھی اور اِدھر اُدھر بھٹکتی پھر رہی تھی۔ میلے کے سلسلے میں پارٹی کا اہتمام شاہ پیلس کے لان پر کیا گیا تھا۔

وہ ٹہل رہی تھی کہ اچانک ایک درخت عقب سے حارث نکلا اور اس کے سامنے کھڑا ہوا۔ وہ بہت اچھے موڈ میں معلوم ہو رہا تھا۔ وہ اسے مہمانوں میں سے ایک ایک کے بارے میں بتاتا رہا۔ وہ ان سب سے' ان کے پس منظر اور حیثیتوں تک سے واقف تھا۔ کس کی مالی حیثیت کیا ہے اور کس کے پاس کتنے اور کتنی مالیت کے زیورات ہیں' اسے سب معلوم تھا۔

"مجھے معلوم ہے' بیشتر معلومات تمہاری گھڑی ہوئی ہیں۔" یاسمین نے کہا۔

"ایسی بات نہیں' یہاں کے سب سے اہم بینک میں میرا ایک دوست کام کرتا ہے۔ لوگ اپنے زیورات بینکوں میں ہی تو رکھواتے ہیں۔"

"لیکن بینک والے اپنے مؤکلوں کے متعلق اس قسم کی معلومات کسی کو بھی فراہم نہیں کرتے۔"

حارث نے قہقہہ لگایا اور موضوع بدل دیا' وہ ٹہلتے رہے۔ اسی دوران یاسمین کو عامر اور ناصرہ کی جھلک دکھائی دی پھر ان کا ٹکراؤ بیگم شاہ سے ہوا' جو حارث کو ڈھونڈتی پھر رہی تھیں۔

"چلو میرے ساتھ۔" بیگم شاہ نے حارث سے کہا۔ "میں تمہیں عرفان سے ملوانا چاہتی ہوں' وہ لکڑی کی مورتیاں بڑی مہارت سے تراشتا ہے۔ تم تصویر کھنچوانے اور

بنوانے کے لئے بھی تیار نہیں ہوتے۔ یہی سہی' لکڑی کی مورت ہی بنوا دو میرے لئے۔" انہوں نے حارث کا ہاتھ پکڑ کر کھینچا لیکن حارث نے بڑی نرمی سے اپنا ہاتھ چھڑایا اور ایک طرف بڑھ گیا۔

یاسمین نے اس لمحے حارث کی ایک جھلک دیکھی اور حیران رہ گئی۔ چہرے کتنی تیزی سے بدل جاتے ہیں۔ حارث بہت زیادہ غصے میں تھا۔ اس کا چہرہ یاسمین کو ایک اور خوفناک چہرے کی یاد دلا رہا تھا لیکن وہ جانتی تھی کہ یہ اس کی حماقت ہے' وہم ہے۔ کاش! پولیس قاتل ڈرائیور کو گرفتار کر لے تو وہم کی یہ دھند ہی چھٹ جائے۔

☆======☆======☆

جج شاکر علی اسٹیج پر کھڑے تھے۔ "مجھے خوشی بھی ہے اور حیرت بھی کہ اتنے بہت سے لوگ میرے تجربات کے متعلق جاننا چاہتے ہیں۔" انہوں نے کہا۔ "سراغرسی کے سلسلے میں میرے تجربات و مشاہدات عجیب و غریب ہیں۔ قتل اور چوری کے بہت سے کیس ایک معمولی سے سراغ کی وجہ سے حل ہو سکتے ہیں۔ میں یقین سے کہتا ہوں کہ بڑے سے بڑا مجرم بھی کہیں نہ کہیں کوئی غلطی کرتا ہے اور سراغ چھوڑ جاتا ہے۔ حالانکہ اسے اپنے طور پر یہی یقین ہوتا ہے کہ اس سے کوئی لغزش نہیں ہوئی۔ غیر پیشہ ور مجرموں کی تو بساط ہی کیا ہے۔

"کیا آپ تصور کر سکتے ہیں کہ ایک قاتل کو محض سفید اُلّو کے ایک پر کی وجہ سے پکڑا جا سکا؟ وہ شادی شدہ تھا' معمر تھا لیکن اسے ایک نوجوان لڑکی سے محبت ہو گئی۔ لڑکی نے اظہارِ محبت کے جواب میں ہمیشہ شادی شدہ ہونے کے حوالے سے اس کا مذاق اُڑایا۔ حالانکہ اس کا مطلب صرف یہ تھا کہ ان کی عمروں میں بہت زیادہ تفاوت ہے۔ تاہم مرد پر اس کا ردعمل یہ ہوا کہ بیوی کو راہ کی رکاوٹ سمجھنے لگا۔

"بعد میں اس کی بیوی قتل کر دی گئی۔ شوہر کا دعویٰ تھا کہ قاتل کوئی چور ہے۔ اس نے یہ بیان دیا کہ وہ اپنی بیوی کے ساتھ ایک تقریب سے واپس آیا۔ اس رات بارہ بجے کے بعد کا وقت تھا۔ اس نے دروازہ کھولا۔ کسی نے اس کے سر پر وار کیا۔ وار شاید اوچھا پڑا تھا' اس لئے وہ بچ گیا۔ بہرحال' اسے ہوش نہ رہا۔ ہوش آیا تو اس نے بیوی کی لاش

دیکھی جو چور کا وار نہ سہہ سکی تھی۔

"پولیس نے تفتیش شروع کی۔ انہیں آلہ قتل کی تلاش تھی اور وہ انہیں فوراً ہی مل گیا۔ وہ ایک ہتھوڑا تھا......... نیا ہتھوڑا' جس کا سر ایک اخبار میں لپٹا ہوا تھا۔ قاتل نے سب سے پہلے مکان میں داخل ہونے کی غرض سے ایک کھڑکی کا شیشہ توڑا تھا۔ شاید آواز کم کرنے کے لئے اس نے ہتھوڑے کے سر پر اخبار لپیٹ دیا تھا۔ وہ مکان میں داخل ہوا لیکن نکلنے سے پہلے ہی اسے ان میاں بیوی کا سامنا کرنا پڑ گیا۔ چنانچہ اس نے ان دونوں پر حملہ کر دیا۔ بیوی کے سر کی چوٹ مہلک ثابت ہوئی۔

"پولیس نے یہ نتیجہ نکالا کہ وہ چوری کی غرض سے داخل ہوا تھا۔ الماری میں سے کچھ زیورات غائب تھے۔ اس کے علاوہ خاتونِ خانہ کی موت کے بعد وہ تمام زیورات جو وہ پہنے ہوئے تھی' اتار لئے گئے تھے۔ شوہر کے بٹوے سے ساڑھے سات سو روپے بھی غائب تھے۔

"تفتیش بے حد دشوار ثابت ہوئی۔ مجرم نے کہیں انگلیوں کے نشانات نہیں چھوڑے تھے۔ مکان میں کہیں سگریٹ کے ٹوٹے بھی نہیں پائے گئے تھے۔ پولیس کے لئے لے دے کر بس وہ ایک ہتھوڑا ہی تھا۔ ہتھوڑا بالکل نیا تھا۔ شوہر کا کہنا تھا کہ ہتھوڑا ہمارا نہیں ہے۔ گویا ہتھوڑا بھی کسی قسم کا سراغ فراہم نہ کر سکا۔

"پھر ہتھوڑے کے آہنی سر پر لپٹا ہوا اخبار کھولا گیا۔ وہ گزشتہ روز کا اخبار تھا لیکن عجیب بات یہ ہوئی کہ اخبار کے ساتھ ایک سفید پر چپکا ہوا تھا اور اس سفید پر نے کیس حل کر دیا۔ اس گھر میں ایک اسٹینڈ پر ایک بھس بھرا ہوا سفید اُلّو موجود تھا۔ وہ پر اسی اُلّو کا تھا۔ کیمیاوی تجزیئے سے یہ بات ثابت ہو گئی۔ مکان کے عقبی صحن میں ایک کیاری میں سے زیورات اور چرائی ہوئی رقم بھی برآمد ہو گئی۔ شوہر پر بیوی کے قتل کا مقدمہ چلا اور جرم بھی ثابت ہو گیا۔ ایسے ہی ایک اور کیس میں.........."

جج شاکر علی نے ایسے تین چار واقعات سنائے پھر انہوں نے کہا۔ "حاضرین! میں یہ بتانا چاہتا ہوں کہ جرم کبھی نہیں پھلتا۔ صرف یہی نہیں بلکہ معمولی سا سراغ بھی مجرموں کی گرفتاری کا سبب بن جاتا ہے۔"

سب لوگ تالیاں بجا رہے تھے۔ یاسمین نے دیکھا' حارث کسی سنگی بت کی طرح ساکت و صامت تھا۔

☆======☆======☆

وارث شاہ صاحب کے نمائندے نے دارالحکومت میں کچھ چوبی مجسمے خریدے تھے۔ شاہ صاحب نے اپنی بیگم کی اجازت سے ایک دن کے لئے یاسمین کی خدمات مستعار لیں۔ انہوں نے چوبی مجسّموں کے سلسلے میں باقاعدہ کیٹلاگ بنا رکھا تھا۔ اس وقت وہ یاسمین کو اسی سلسلے میں کچھ سمجھا رہے تھے۔

یاسمین نے چوبی مجسّموں کی پیکنگز کھول ڈالیں اور کام میں مصروف ہو گئی۔ وہ کام میں اتنی گم تھی کہ اسے دروازہ کھلنے تک کا پتا نہیں چلا۔ حارث نے جب اس کے عین پیچھے کھڑے ہو کر اسے پکارا تو وہ اچھل پڑی۔

"بڑی کھوئی ہوئی ہو کام میں۔" حارث نے کہا اور مجسّمے ایک طرف ہٹا کر میز پر اپنے بیٹھنے کی جگہ بنائی۔

"دیکھ کر......... یہ بہت نازک ہیں۔ گر گئے تو ٹوٹ بھی سکتے ہیں۔"

"کاٹھ کباڑ ہے یہ سب۔" حارث نے بے پروائی سے کہا۔

"تو تم مجھ سے یہی کہنے آئے تھے۔ بس اب جاؤ اور مجھے کام کرنے دو۔"

"کام چھوڑو' اس وقت مجھے تم سے کچھ بات کرنا ہے۔" حارث نے کہا۔

یاسمین نے سرد آہ بھری' کیٹلاگ بک ایک طرف رکھی اور سوالیہ نظروں سے حارث کو دیکھنے لگی۔

"کل جج شاکر علی نے جو لیکچر دیا' وہ تمہارا آئیڈیا تھا؟"

"نہیں' آئیڈیا عامر کا تھا اور بیگم شاہ نے بیگم باقر تک پہنچایا تھا۔"

"عامر......... لعنت ہے........." حارث غرایا۔ "لیکن مجھے یقین ہے کہ عامر کو یہ بات تمہی نے سجھائی ہو گی۔"

"ہرگز نہیں' لیکن مجھے لطف آیا اور میرے خیال میں سبھی لوگ محظوظ ہوئے۔"

"میرے خیال میں صرف تم محظوظ ہوئیں۔ ویسے بھی تم جج کے کالج کی طرف کچھ

زیادہ ہی جاننے لگی ہو۔ شاید اس سے مجرموں کی شناخت کے طریقوں پر گفتگو کرتی ہوگی۔"

"مجھے یہ موضوع بہت دلچسپ لگتا ہے۔"

"اس قاتل ڈرائیور کا چہرہ پوری طرح یاد آیا تمہیں؟ جج نے اس سلسلے میں کیا مشورہ دیا تمہیں؟"

یاسمین اسے بغور دیکھ رہی تھی۔ اس وقت حارث خوبرو نہیں لگ رہا تھا۔ سکڑی ہوئی آنکھیں' بھینچے ہوئے ہونٹ' اس وقت وہ ہوش مند بھی نہیں لگ رہا تھا۔ "میں نے جج صاحب سے اس سلسلے میں کوئی بات نہیں کی۔" بالآخر یاسمین نے کہا۔ "میں اس واقعے کو بھول جانا چاہتی ہوں۔"

"جھوٹ نہ بولو' اگر یہ بات ہوتی تو تم اس اخبار کی دوسری کاپی کیوں منگواتیں' جس میں کیس کی پیش رفت کی خبر چھپی ہے۔"

یاسمین سن ہو کر رہ گئی۔ اخبار کی دوسری کاپی ابھی اس تک نہیں پہنچی تھی۔ گویا حارث نے درمیان ہی میں غائب کر دی تھی اور اب وہ خود بتا رہا ہے کہ اس میں اس کیس کے متعلق خبر چھپی تھی۔ وہ خوفزدہ ہو گئی۔ کیوں؟ آخر حارث اس کیس میں اتنی دلچسپی کیوں لے رہا ہے۔ کیا وہی؟ کیا وہی.......... لیکن اس سے آگے اس سے سوچا نہیں گیا۔ نہیں' حارث وہ قاتل ڈرائیور نہیں ہو سکتا اور اگر یہ درست ہے تو اسے فوری طور پر شاہ پیلس سے نکل بھاگنا ہوگا۔

حارث نے جیسے اس کے خیالات پڑھ لئے۔ "اگر بھاگنے کے متعلق سوچ رہی ہو تو میرا مشورہ ہے کہ اس قسم کی احمقانہ کوشش نہ کرنا۔" اس نے کہا۔

یاسمین کا چہرہ سفید پڑ گیا۔

"ارے! میں تو یونہی تمہیں ڈرا رہا تھا۔ تم جرم اور مجرموں میں اتنی دلچسپی لیتی ہو۔ میں تم پر ثابت کرنا چاہتا تھا کہ خوف کا ذائقہ کیسا ہوتا ہے۔ میری بات مانو تو جج اور اس کے مسودے سے دور ہی رہو۔ وہ جرائم کے بارے میں کچھ بھی نہیں جانتا۔ وہ صرف عدالتی کارروائیوں سے واقف ہے۔" یہ کہہ کر وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ "سچی! تم مجھے اچھی لگتی

ہو' مجھے اس بات پر متاسف ہونے کا موقع نہ دینا کہ میں نے تم سے محبت کی ہے۔"

اس کے جانے کے بعد یاسمین نے کیٹلاگ اٹھایا تو اس کے ہاتھ لرز رہے تھے۔

کاش' کوئی ایسا ہوتا' جس کے سامنے وہ اپنے دل کا بوجھ ہلکا کر سکتی۔ جج؟ لیکن سوال یہ تھا کہ اس کے پاس بتانے کے لئے ہے کیا' یہ بھی کوئی بات ہے کہ حارث کو دیکھ کر اسے قاتل ڈرائیور کا چہرہ یاد آتا ہے' جبکہ یہ بات وہ پہلے ہی کہہ چکی ہے کہ وہ قاتل ڈرائیور کی مثبت طور پر شناخت نہیں کر سکتی اور پھر حارث نے اپنی تنبیہہ کے سلسلے میں وضاحت بھی تو کر دی ہے' وہ اس سے محبت کرتا ہے اور نہیں چاہتا کہ جرائم اور مجرموں کے چکر میں پڑ کر وہ کسی خطرے سے دوچار ہو۔

☆------☆------☆

آئندہ چند ہفتے یکسانیت سے گزرے۔ بیگم شاہ کی سوشل مصروفیات کا لامتناہی سلسلہ جاری تھا۔ اگر وہ مصروفیات لامتناہی نہ ہوتیں تو اسے ملازمت کیسے ملتی۔ ہفتے میں تین چار بار وہ جج کے کاٹیج جاتی اور اس کی کتاب کا مسودہ ٹائپ کرتی۔ ایسے میں اسے ٹائپنگ کا کام بھی فنون سے متعلق معلوم ہونے لگتا۔ جج نے جو کچھ لکھا تھا' وہ آرٹ ہی کے زمرے میں آتا تھا۔

عامر عموماً غائب رہتا' وہ چٹانوں میں سر کھپاتا رہتا لیکن شام کو وہ واپس آتا اور یاسمین کو شاہ پیلس چھوڑ کر آتا۔ اکثر ایسا ہوتا کہ یاسمین' کار میں جانے پر جنگل کے مختصر راستے سے پیدل سفر کو ترجیح دیتی۔ عامر اس کے ساتھ ہوتا۔ وہ دیودار کے درختوں کے درمیان سے ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے گزرتے۔ ایسے ہی ایک لمحے میں یاسمین پر منکشف ہوا کہ وہ عامر سے محبت کرنے لگی ہے۔ اس نے اس خیال کو ذہن سے دھکیل کر نکالنا چاہا لیکن ناکام رہی۔ وہ حیران تھی کہ محبت اتنے چپکے چپکے دل میں گھر کرتی ہے کہ آدمی کو پتہ ہی نہیں چلتا اور جب پتہ چلتا ہے تو بہت دیر ہو چکی ہوتی ہے۔

اسی طرح جون کا مہینہ بھی گزر گیا پھر جولائی آ گیا اور پھر اگست آ گیا۔ ہر طرف یوم آزادی کی تقریبات کا شور تھا۔ یوم آزادی پر شاہ پیلس میں مہمانوں کا جمگھٹا تھا۔ یاسمین کو خادماؤں کی زبانی پتہ چلا کہ بیشتر مہمان بھاری زیورات اپنے ساتھ لائے ہیں۔۔ یاسمین کو

نیلم کی وہ انگوٹھی یاد آ گئی جو حارث نے اسے دی تھی۔ وہ یہ سوچ کر لرزتی رہی کہ اگر کسی نے وہ انگوٹھی دیکھ لی تو وہ اس سلسلے میں کیا وضاحت کرے گی' وہ کئی بار کہہ چکی تھی کہ اس کے پاس کوئی زیور نہیں ہے۔

حارث کسی کاروباری سلسلے میں باہر گیا ہوا تھا۔ یاسمین اکثر اس کے متعلق سوچتی۔ حارث ہمیشہ یہی ظاہر کرتا تھا کہ وہ اس سے بہت متاثر ہے اور اس کی محبت میں گرفتار ہے۔ یہ کہنا مشکل تھا کہ وہ سچا ہے......... یا محض اپنی انا کی تسکین کے لئے جواباً اس کی محبت حاصل کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ اتنا تو یاسمین کو اندازہ تھا کہ حارث کے لئے اس کی انا بہت زیادہ اہم ہے۔

ان دنوں یاسمین اور ناصرہ کے درمیان عارضی جنگ بندی تھی۔ وہ یوم آزادی کے سلسلے میں شاہ پیلس کی آرائش میں مصروف تھیں۔ ہر طرف جھنڈیاں اور برقی قمقمے لگائے جا رہے تھے۔ ناصرہ کو غباروں کا خبط تھا۔ شاہ صاحب نے شاہ پیلس کے لئے بہت بڑا اور اونچا پرچم بنوایا تھا۔

یوم آزادی کی صبح یاسمین تنہا کام کر رہی تھی۔ ناصرہ ساڑھے دس بجے کے قریب آئی۔ اس نے بتایا کہ کنٹری کلب میں اس کا ٹینس میچ ہے۔ یاسمین کو معلوم تھا کہ یوم آزادی کی تقریب کے سلسلے میں کنٹری کلب میں بہت بڑا اجتماع ہو گا۔

"عامر گیارہ بجے مجھے لینے کے لئے آئے گا۔" ناصرہ نے دھماکا کیا۔

یاسمین ششدر رہ گئی۔ "عامر!"

"ہاں' وہی تو میرا پارٹنر ہے۔ وہ ٹینس کا بہت اچھا کھلاڑی ہے۔ میری خوش قسمتی ہے کہ اس نے بالآخر مجھے اپنا پارٹنر بنا کر چھوڑا۔ ہم یقیناً یہ میچ جیتیں گے۔"

یاسمین بجھ سی گئی' وہ ناصرہ کے پاس سے ہٹ آئی۔ عامر نے اسے بتایا تک نہیں کہ اس نے ناصرہ کے ساتھ کوئی پروگرام بنایا ہے اور وہ کب سے یہ خواب دیکھ رہی تھی کہ یوم آزادی وہ عامر کے ساتھ منائے گی۔ اسے کنٹری کلب میں مدعو نہیں کیا گیا تھا۔ اسے اس بات کی پروا بھی نہیں تھی۔ اس نے سوچا تھا کہ عامر کے ساتھ جنگل میں خوب گھومے پھرے گی' پکنک منائے گی۔

انہی خیالات میں غلطاں و پیچاں وہ اپنے کمرے میں چلی آئی۔ کچھ دیر بعد گاڑی کی آواز سنائی دی۔ اس نے کھڑکی سے جھانکا' عامر نے ہارن بجایا اور ناصرہ تیزی سے کار کی طرف لپکی۔ وہ اگلی نشست پر بیٹھی اور اگلے ہی لمحے کار روانہ ہو گئی۔ عامر' ناصرہ کو لینے آیا تھا اور اس نے اس کے بارے میں پوچھا تک نہیں تھا۔

وہ بالکونی میں کرسی ڈال کر بیٹھ گئی اور خود سے بحث کرتی رہی۔ اس نے خود ہی تو فرض کر لیا تھا کہ عامر آج کا دن اس کے ساتھ گزار لے گا۔ عامر نے ایسا کوئی وعدہ تو نہیں کیا تھا۔ اس کے باوجود اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے' وہ خود کو کسی ننھے بچے کی طرح محسوس کر رہی تھی جسے سب نے نظرانداز کر دیا ہو۔

سب لوگ چلے گئے تھے۔ اب گھر میں اس کے اور ملازمین کے سوا کوئی نہیں تھا۔ وہ آفس روم میں چلی آئی۔ دوپہر کا کھانا اس نے آفس روم ہی میں کھایا۔ آفس میں کام کرتے ہوئے اسے احساس ہوا کہ بیکاری میں کام کی کوئی کمی نہیں ہوتی۔

وہ کام میں جتی رہی پھر دروازے پر ہلکی سی دستک ہوئی۔ دروازہ کھلا اور وہ عامر کو دیکھ کر حیران رہ گئی۔

"تو تم یہاں چھپی بیٹھی ہو' میں تو سمجھا تھا کہ حارث کے ساتھ ہو گی۔" عامر نے کہا۔

"میں تو صبح سے یہیں ہوں۔" یاسمین نے مختصراً کہا پھر باوقار لہجے میں پوچھا۔ "تم جیت گئے؟"

"ہاں میں یہ کہوں گا کہ ہم جیت گئے۔ ناصرہ کا کھیل بہت اچھا ہے۔"

"مبارک ہو۔" یاسمین نے آہستہ سے کہا۔

"لیکن حارث کہاں ہے' ناصرہ نے تو کہا تھا کہ تم حارث کے ساتھ ہو گی۔"

"حارث تو یہاں ہے ہی نہیں۔ وہ تو کل ہی شہر سے باہر چلا گیا تھا۔"

عامر کرسی پر بیٹھ گیا اور اس نے دونوں ہاتھوں سے سر تھام لیا۔ "خدا کی پناہ......... تو ناصرہ نے میرے لئے جال بچھایا تھا۔ اس نے مجھے فون پر بتایا کہ تم حارث کے ساتھ جا رہی ہو اور وہ رو رہی تھی۔ اس کا ٹینس کا پارٹنر فیض کسی وجہ سے میچ کھیلنے سے قاصر تھا۔

اس نے مجھ سے درخواست کی کہ میں اس کا ساتھ دوں۔ تمہاری مصروفیت کی وجہ سے میں نے ہامی بھرلی لیکن میچ ختم ہوتے ہی پتا ہے' کیا ہوا؟ وہ فیض کی بانہوں میں بانہیں ڈالے ایک طرف چلی گئی اور میں منہ دیکھتا رہ گیا۔ غضب خدا کا' میں کتنا بے وقوف ہوں کہ اس کے جال میں آگیا' تم مجھے معاف کردو گی یاسمین؟"

"ارے' ایسی کوئی بات نہیں۔"

"تو ٹھیک ہے' تم میرے ساتھ چلو۔"

☆------☆------☆

اس رات یاسمین بے حد خوش تھی۔ عامر کے ساتھ وقت بہت اچھا گزرا تھا۔ عامر ہر اعتبار سے بے حد مہذب آدمی تھا۔ اس کے رویئے میں شائستگی تھی۔ ان کے درمیان محبت کی کوئی بات نہیں ہوئی لیکن ان کی آنکھوں نے سب کچھ کہہ دیا۔ اشارتاً شادی کی گفتگو بھی ہوئی تھی۔

وہ گھر پہنچی تو وہاں سناٹا تھا۔ میزبان اور مہمان ابھی تک واپس نہیں آئے تھے۔ ملازمین اپنے اپنے کوارٹرز میں تھے' وہ اپنے کمرے میں چلی گئی۔ بستر پر لیٹ کر وہ دیر تک عامر اور اس کے ساتھ گزارے ہوئے وقت کے متعلق سوچتی رہی۔ یہی کچھ سوچتے سوچتے اسے نیند آگئی۔

وہ گہری نیند میں تھی۔ اس کے باوجود اس کی آنکھ کھل گئی۔ شاید اس کی وجہ طوفان تھا۔ بادل گرج رہے تھے' بجلی چمک رہی تھی' کمرے کی کھڑکی کھلی ہوئی تھی اور اس میں سے پانی بوچھار کی صورت میں اندر آرہا تھا۔ اس نے سوچا کہ اٹھ کر کھڑکی بند کردے لیکن تساہل نے اسے اٹھنے نہ دیا۔ وہ سوچتی رہی کہ اٹھے یا نہ اٹھے پھر اچانک ہی اسے احساس ہوا کہ اس کی آنکھ کھلنے کا سبب صرف طوفان نہیں ہے' اس کے ساتھ ہی اسے کمرے میں کسی کی نقل و حرکت کا احساس ہوا اور وہ خوف کے مارے ٹھٹھر کر رہ گئی۔

کمرے میں کوئی تھا......... ڈریسر کے قریب کوئی سایہ تھا جو ڈریسر پر جھکا ہوا تھا۔

اس نے بمشکل خود کو چیخنے سے باز رکھا۔ اس کا جسم اکڑ گیا' وہ خود کو پوری طرح ساکت رکھنے کی کوشش کررہی تھی۔

بجلی کا جھماکا ہوا۔ بجلی جیسے کمرے میں اتر آئی ہو۔ اسی وقت کمرے میں روشنی ہو گئی۔ اس نے آنکھیں بند کرلیں' کوئی اسے دیکھ رہا تھا اور وہ نہیں چاہتی تھی کہ اسے اس پر بیدار ہونے کا شبہ ہو۔ چند لمحے اسی عالم میں گزرے پھر کمرے میں اندھیرا ہو گیا۔ اس نے آنکھیں کھول دیں' کمرے میں اب کوئی بھی نہیں تھا لیکن یہ احساس روشنی کے بعد اچانک گھپ اندھیرے کی وجہ سے تھا۔ چند لمحے بعد اسے وہ سایہ پھر نظر آیا' اس بار اسے یقین ہو گیا کہ وہ کوئی مرد ہے' وہ اب بھی جھکا کھڑا تھا پھر وہ سیدھا ہو گیا' شاید اسے جس چیز کی تلاش تھی' وہ مل گئی تھی' اس نے روشنی بھی اسی لیے کی ہوگی۔

اب وہ سایہ دروازے کی طرف بڑھ رہا تھا۔ دروازہ تھوڑا سا کھلا اور سایہ باہر نکل گیا۔ باہر راہداری تاریک تھی حالانکہ ہر رات وہاں کم روشنی کا ایک بلب آن چھوڑ دیا جاتا تھا۔ دروازہ اب بھی تھوڑا سا کھلا ہوا تھا لیکن باہر تاریکی کے سوا کچھ بھی نہیں تھا۔ مداخلت کار نے دروازہ پوری طرح بند نہیں کیا تھا۔ شاید وہ نہیں چاہتا تھا کہ وہ جاگ جائے۔ یہ امکان بھی تھا کہ وہ دروازے سے لگا کھڑا ہو۔ اس کا ردعمل دیکھنے کے لئے۔ شاید اسے یہ یقین نہ ہو کہ وہ واقعی سو رہی ہے اور اس نے کچھ بھی نہیں دیکھا۔

وہ دیر تک بستر پر ساکت رہی۔ اس کی اٹھنے کی ہمت نہیں ہوئی۔ بالآخر اس نے ہاتھ بڑھا کر بیڈ لیمپ روشن کردیا۔ باہر اب کوئی آہٹ نہیں تھی۔ وہ ہمت کرکے اٹھی اور دروازے کی طرف بڑھی' اس نے دروازہ بند کیا اور بولٹ بھی چڑھا دیئے۔ یہاں قیام کے دوران پہلی بار اسے بولٹ چڑھانے کی ضرورت محسوس ہوئی تھی۔ پھر وہ ڈریسر کی طرف بڑھی۔ اسے جاننا تھا کہ سایہ کس چیز کی تلاش میں وہاں آیا تھا۔

اس نے ڈریسر کا جائزہ لیا' اس کا ہینڈ بیگ اوپر ہی رکھا تھا۔ سب کچھ ویسا ہی تھا۔ جیسا اس نے سوتے وقت چھوڑا تھا۔ بہ ظاہر تو کوئی چیز نہیں چھیڑی گئی تھی لیکن پھر ایک خیال نے اسے چونکا دیا۔ نیلم کی انگوٹھی والا لاکٹ! وہ اوپر ہی رکھا تھا اور اب موجود نہیں تھا۔ اس نے پورا ڈریسر چھان مارا لیکن لاکٹ نہ ملا۔ اسے یقین ہو گیا کہ چور کو لاکٹ ہی کی تلاش تھی لیکن لاکٹ کے بارے میں کسی کو بھی تو نہیں معلوم تھا۔ سوائے حارث کے......... اور حارث شہر سے باہر گیا ہوا تھا۔

وہ سوچ میں پڑ گئی کہ کیا کرے' شور مچائے؟ لیکن چور جا چکا تھا اور کیا پتا' وہ کسی اور کمرے میں ہو۔ اس وقت شاہ پیلس میں جواہرات تو بہت تھے' یقیناً یہی بات ہوگی۔ تو کیا وہ پولیس کو فون کرے؟ لیکن اس صورت میں اسے بتانا ہوگا کہ چور اس کے کمرے میں آیا تھا اور اس نے اس کی نیلم والی قیمتی انگوٹھی چرا لی ہے' اس صورت میں پولیس اس سے انگوٹھی کے بارے میں پوچھے گی' اگر اس نے حارث کا نام لیا تو حارث سے پوچھ گچھ ہوگی اور حارث کو اس پر غصہ آئے گا' وہ حارث کے غصے سے خوفزدہ تھی پھر کہیں ایسا نہ ہو کہ انگوٹھی کا تعلق دارالحکومت میں اس رات کار کے ذریعے قتل کی اس واردات سے ثابت ہو جائے۔ بظاہر تو کوئی ایسا امکان نہیں تھا لیکن نہ جانے کیوں' اسے شدت سے یہ خیال آ رہا تھا کہ اس طرح وہ حارث کے لئے مشکلات کھڑی کر دے گی۔

پھر اسے ایک اور خیال آیا' اگر شاہ پیلس میں مہمانوں کے زیورات چوری ہوئے ہیں تو وہ یقینی طور پر پولیس کو مطلع کریں گے چنانچہ ہر چیز کا فیصلہ صبح ہو جائے گا۔ وہ مطمئن ہو گئی۔ بارش نہ جانے کب کی رک چکی تھی پھر بھی اس نے کھڑکی بند کرنا ضروری سمجھا۔ اس کے بعد وہ بستر پر دراز ہو گئی۔ کچھ ہی دیر بعد اسے نیند آ گئی لیکن وہ اچھی نیند نہیں تھی۔

☆======☆======☆

اگلی صبح ثابت ہو گیا کہ اس کا فیصلہ درست تھا۔ رات کو شاہ پیلس ڈکیتی کی بہت بڑی واردات کی زد میں آیا تھا۔ چرائے جانے والے زیورات کی مالیت کا تخمینہ لاکھوں میں لگایا گیا۔ دن بھر پولیس کی آمد و رفت کا سلسلہ جاری رہا۔ پولیس کے خیال میں یہ ایک منظم گروہ کا کام تھا جو اس سے پہلے بھی کئی وارداتوں میں ملوث رہا تھا۔ تفتیش میں یاسمین کو بھی شامل کیا گیا لیکن اسے زیادہ اہمیت نہیں دی گئی۔

حارث کی واپسی ایک ہفتے بعد ہوئی' وہ اخبارات میں ڈکیتی کی تفصیل پڑھ چکا تھا۔ یہ جان کر وہ بہت خوش ہوا کہ ممی کے تمام زیورات محفوظ ہیں۔ "یہ تو چور کی مہربانی ہے۔" اس نے بیگم شاہ سے کہا۔

"ہاں' مجھے تو چور اپنے رشتے دار لگتے ہیں۔" بیگم شاہ نے ہنستے ہوئے کہا۔

"میں شروع ہی سے کہہ رہا تھا کہ آپ زیورات لاکر میں رکھوا دیں۔" حارث نے سنجیدگی سے کہا۔

"میرے زیورات لکی ہیں۔" بیگم شاہ نے بے پروائی سے کہا۔ "دیکھو نا' پچھلی ڈکیتی میں بھی میرے زیورات محفوظ رہ گئے تھے۔"

"پولیس کا کیا خیال ہے۔ دونوں وارداتیں ایک ہی گروہ نے کی ہیں۔" حارث نے پوچھا۔

"ہاں' ان کا یہی خیال ہے۔ ملازمین سے بڑی سختی سے پوچھ گچھ کی گئی۔ تاہم بدقسمت مہمانوں کو جانے کی اجازت مل گئی۔"

☆======☆======☆

اگلی صبح یاسمین لان میں چہل قدمی کر رہی تھی کہ حارث آ گیا۔ اس کے چہرے پر اس بلی کا سا تاثر تھا جو ملائی کھا کر آئی ہو۔ یاسمین کا دل ڈوبنے لگا۔ اب اسے یقین ہو گیا کہ وہ حارث سے خوفزدہ ہے۔

"بہت اچھی لگ رہی ہو۔" حارث نے رومانی لہجے میں کہا۔

یاسمین نے جلدی سے موضوع بدلا۔ "کہو' تمہارا کاروباری دورہ کیسا رہا؟"

"ٹھیک ٹھاک' ایک بات بتاؤ' تمہیں میری کمی محسوس ہوئی تھی؟"

"میرا یوم آزادی بہت اچھا گزرا' میرا مطلب ہے' ڈکیتی سے پہلے کا وقت۔"

"اور وہ انگوٹھی کہاں ہے' مجھے تمہاری زنجیر نظر نہیں آ رہی ہے۔"

"وہ.......... وہ.......... وہ.........." یاسمین کی زبان لڑکھڑا گئی۔ "وہ تو کہیں کھو گئی' شاید میں کہیں رکھ کر بھول گئی۔"

"کب کی بات ہے؟"

"ڈکیتی کی رات کی۔"

"اس کا مطلب ہے" وہ بھی چوری ہو گئی لیکن اخبارات میں جو مسروقہ زیورات کی فہرست شائع ہوئی ہے' اس میں تو وہ شامل نہیں۔"

"میں نے اس کا کسی سے تذکرہ نہیں کیا۔ میرا خیال تھا.........."

"کہ وہ چوری کی ہے۔" حارث نے زہریلے لہجے میں کہا۔

"یہ بات نہیں' میرا خیال تھا کہ کہیں رکھ کے بھول گئی ہوں۔ تلاش کروں گی تو مل جائے گی۔"

"جھوٹ مت بولو۔" حارث نے سخت لہجے میں کہا۔ "تم نے اس کی رپورٹ اس لئے نہیں کرائی کہ تم خوفزدہ تھیں کیونکہ تمہیں وہ انگوٹھی میں نے دی تھی۔ تم مجھے چور سمجھتی ہو۔"

"نہیں حارث' میں ایسا نہیں سمجھتی۔ میں اتنا جانتی ہوں کہ تم پریشان ہو' تم کسی اور کا غصہ مجھ پر اتار رہے ہو۔ میں یہ برداشت نہیں.........."

"نہیں کر سکتیں تو نہ کرو' اور سنو! اب یہ کہانی لے کر جج کے پاس نہ دوڑ جانا۔" یہ کہہ کر وہ پلٹا اور مکان کی طرف چلا گیا۔

یاسمین اپنے آفس روم میں چلی آئی' وہ فوراً ہی کام میں مصروف ہو گئی لیکن اسے اپنی توجہ کام پر مرکوز رکھنے میں دشواری ہو رہی تھی۔ وہ حارث کے انداز اور لہجے کے بارے میں سوچے جا رہی تھی۔ کیا وہ ذہنی مریض تھا؟ یاسمین کو اپنی یہ ملازمت بہت پسند تھی۔ بس کاش! کاش حارث موجود نہ ہو۔ آخر وہ میرے پیچھے کیوں پڑ گیا ہے۔

☆======☆======☆

پولیس کی تفتیش کی گاڑی رینگ رینگ کر چل رہی تھی۔ یاسمین کو جب فرصت ہوتی' وہ جج شاکر علی کے کاٹیج کا رخ کرتی۔ اس نے مسودے کا خاصا بڑا حصہ ٹائپ کر دیا تھا۔ کبھی کبھی ٹائپ کرنے کے بجائے وہ جج صاحب کی باتیں' ان کے تجربات سنتی رہتی۔

کئی بار اس نے سوچا کہ قاتل ڈرائیور اور حارث کی مشابہت کے بارے میں جج صاحب کو بتا کر دل کا بوجھ ہلکا کر لے لیکن وہ خوفزدہ تھی کہ جج صاحب اسے اس سلسلے میں کوئی عملی قدم اٹھانے کا مشورہ دیں گے بلکہ اصرار کریں گے۔

ایک دن تو اس نے فیصلہ کر لیا کہ اب یہ بوجھ ہلکا کر کے رہے گی لیکن اسی دن جج کو غلط شناخت کا ایک اور کیس یاد آ گیا۔ اس کیس کے سلسلے میں ایک بے قصور شخص نے چھ سال قید بامشقت کی سزا کاٹی تھی اور چھ سال بعد پتہ چلا تھا کہ مجرم کوئی اور تھا۔ ظاہر

ہے' اس بے چارے کو زندگی کے چھ سال کسی بھی طرح واپس نہیں مل سکتے تھے۔

یاسمین لرز کر رہ گئی۔ مجرموں کو شناخت کرنا واقعی بے حد اہم کام تھا۔ غلط شناخت کسی شخص کی زندگی بھی برباد کر سکتی ہے۔ دل کا بوجھ ہلکا کرنے کے سلسلے میں اس کی ہمت جواب دے گئی تھی۔

اتنی دیر میں عامر آ گیا۔ وہ بہت خوش دکھائی دے رہا تھا۔ اس نے بتایا کہ اسے دارالحکومت میں بہت اچھی ملازمت کی پیشکش ہوئی ہے۔ "مجھے فوری طور پر جانا ہے۔ میں کام کی نوعیت کے بارے میں جاننا چاہتا ہوں۔" اس نے بتایا۔

"اور تمہاری تعلیم؟" یاسمین نے پوچھا۔

"وہ بھی تعلیم ہی ہو گی.......... عملی تعلیم۔"

یاسمین نے مسکرانے کی کوشش کی۔ وہ اداس ہو گئی تھی۔ "مبارک ہو۔" اس نے بجھے بجھے لہجے میں کہا۔

عامر نے اسے بے حد غور سے دیکھا۔ "اگلے مہینے میں واپس آ جاؤں گا۔ کل میری روانگی ہے۔"

"میں بھی تمہارے ساتھ ہی چلوں گا' مجھے ایک پبلشر سے بات کرنا ہے۔" جج شاکر علی نے کہا۔

"اور میں تنہا رہ جاؤں گی۔" یاسمین نے زیر لب کہا۔

عامر اس روز بھی یاسمین کو شاہ پیلس تک چھوڑنے آیا۔ راستے میں اس نے اپنی کار کی چابیاں یاسمین کو دیں۔ "گیراج تو تمہیں معلوم ہی ہے۔ تمہیں کار کی ضرورت پڑ سکتی ہے۔" اس نے کہا۔

"شکریہ!" یاسمین نے چابیاں لیتے ہوئے کہا۔ "واقعی مجھے ضرورت پڑے گی۔ جب تم اور جج صاحب یہاں نہیں ہو گے تو میں فرصت کے اوقات میں لمبی ڈرائیو پر نکل جایا کروں گی۔"

"حارث واپس آ گیا ہے کیا؟" عامر نے پوچھا۔ یاسمین نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

"مجھے افسوس ہے اس کی آمد کا۔ پتہ نہیں کیوں' میں تمہیں اس کے قریب چھوڑ کر جانا

پسند نہیں کرتا۔"

"ارے ایسی کوئی بات نہیں' شاہ پیلس بہت بڑا ہے اور اس میں بہت لوگ رہتے ہیں۔" یاسمین نے کہا۔ ایک لمحے کو اس نے سوچا کہ عامر کے سامنے دل کا بوجھ ہلکا کر دے لیکن اسے اندیشہ تھا کہ اس طرح حارث اور عامر کے درمیان یقیناً ٹھن جائے گی۔ ویسے بھی عامر کو اگلے روز جانا تھا۔ بیکار ہے اسے پریشان کرنا جبکہ معاملہ اس کے مستقبل کا تھا۔ ویسے بھی وہ حارث کے متعلق کیا جانتی تھی.......... کچھ بھی نہیں۔ باتوں سے وہ بہت بڑا گینگسٹر لگتا تھا لیکن اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ کچھ لوگ اپنی اہمیت بڑھانے کے لئے دانستہ ایسا کرتے ہیں۔ ضروری تو نہیں کہ ایسا ہی ہو۔

اب وہ شاہ پیلس کے قریب پہنچ گئے تھے۔ عامر نے یاسمین کا ہاتھ تھام لیا۔ "اگر سارے معاملات ٹھیک ٹھاک ہوئے تو واپسی پر میں تم سے کچھ مانگوں گا۔" اس نے سرگوشی میں کہا۔

"اسی وقت مانگ لو نا۔" یاسمین نے کہا۔ اس کا دل بری طرح دھڑک رہا تھا' وہ اپنے لہجے کی التجا کو چھپا نہیں سکی تھی۔

"نہیں' یہ مناسب وقت نہیں۔ ہر کام اپنے وقت پر ہی اچھا لگتا ہے۔ اچھا' خدا حافظ پھر ملیں گے انشاء اللہ۔"

"خدا حافظ۔" یاسمین نے کہا۔ شاہ پیلس کی حدود میں داخل ہوتے ہوئے وہ بے حد دل گرفتہ تھی۔

☆------☆------☆

عامر کو گئے ہوئے دو دن ہو چکے تھے اور اب تک اس کی کوئی خیر خبر نہیں ملی تھی۔ نہ کوئی خط' نہ فون۔ وہ سوچ رہی تھی کہ کیا عامر کو اس کا بالکل خیال نہیں' کیا وہ اسے بھول گیا ہے۔

اس صبح وہ ناشتے کے دوران اخبار پڑھتی رہی۔ اخبار میں جواہرات کے لٹیروں کی گرفتاری کے متعلق تفصیلی خبر چھپی تھی۔ اسی کے نتیجے میں دارالحکومت میں جواہرات کے ایک ایسے ڈیلر کو گرفتار کیا گیا جو مسروقہ جواہرات خریدتا رہا تھا۔ اس کے ذریعے گینگ

کے پانچ افراد کا پتہ چلا' انہیں گرفتار کر لیا گیا۔ ان کا سرغنہ ایک اور شخص تھا جسے وہ بھورے کے نام سے جانتے تھے۔ یہ نام اس کے بھورے بالوں کی مناسبت سے رکھا گیا تھا۔ اس کے ساتھی اس کے اصل نام اور پتے سے قطعاً ناواقف تھے۔

تفتیش کے نتیجے میں یہ بھی پتہ چلا تھا کہ کچھ عرصہ پہلے گینگ کا چھٹا رکن گینگ سے علیحدہ ہو گیا تھا۔ اس نے جرائم سے توبہ کر لی تھی اور صاف ستھری زندگی گزارنے لگا تھا۔ بھورے کو خدشہ تھا کہ وہ شخص پولیس میں مخبری کر دے گا۔ چنانچہ اس نے اپنے ساتھیوں کو اس کے قتل کے منصوبے میں شریک کرنے کی کوشش کی۔ اس میں ناکامی پر اس نے ایک رات اپنے اس سابق ساتھی کو کار سے کچل کر ہلاک کر دیا۔ وہ شخص ایک مقامی ہوٹل کا مالک تھا اور اس کے قتل کا معمہ اب تک حل نہیں ہو سکا تھا۔ پولیس اب بھورے کو تلاش کر رہی تھی لیکن انہیں اس کے بارے میں زیادہ معلومات نہیں تھیں۔ وہ صرف اتنا جانتے تھے کہ بھورے کے بال گھنگریالے اور بھورے ہیں اور وہ ایک خوش رو نوجوان ہے۔

یاسمین نے اخبار ایک طرف رکھ دیا۔ گویا قتل کا وہ کیس پھر زندہ ہو رہا تھا جسے وہ بھولنے کی کوشش کر رہی تھی۔ اب اگر پولیس نے اسے تفتیش کے سلسلے میں طلب کر لیا تو؟ وہ پریشان ہو گئی۔ اسے یقین تھا کہ حارث نے بھی یہ خبر پڑھ لی ہوگی' وہ پورے دن خوفزدہ رہی۔ فون کی گھنٹی بجتی تو اس کا دل لرزنے لگتا۔

رات کے کھانے کے بعد وہ لائبریری میں گئی تاکہ وقت گزارنے کے لئے کوئی کتاب نکال لے۔ اسی وقت حارث اس کے پاس چلا آیا۔ "باہر چلو' مجھے تم سے کچھ بات کرنا ہے۔" اس نے یاسمین سے کہا۔

یاسمین ہچکچائی۔ "میں بہت تھک گئی ہوں' میں اپنے کمرے میں جا رہی ہوں۔"

حارث نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ "میں زیادہ وقت نہیں لوں گا۔"

یاسمین انکار نہ کر سکی' وہ اس کے پیچھے باہر نکل آئی۔ حارث لان کے دور افتادہ گوشے کی طرف بڑھا۔ وہ دونوں گلاب کی بڑی جھاڑی کے عقب میں بنچ پر بیٹھ گئے۔

"کیا عامر کا تم سے شادی کا ارادہ ہے؟" حارث نے پوچھا۔

"نہیں، لیکن تمہیں اسے کوئی غرض نہیں ہونی چاہئے‘ میں جا رہی ہوں۔" یہ کہہ کر یاسمین اٹھ کھڑی ہوئی۔

حارث نے اس کا ہاتھ پکڑ کر کھینچا۔ گرفت بے حد سخت تھی۔ "تم نے اخبار میں وہ خبر پڑھ لی ہے اور اب تم پولیس کو مطلع کرو گی کہ قاتل ڈرائیور میں تھا۔" اس نے تند لہجے میں کہا۔

"ہرگز نہیں اور میرے خیال میں تم وہ ڈرائیور بھی نہیں ہو۔" یاسمین نے تردید کی۔

"لیکن میں وہ ڈرائیور ہوں۔" حارث نے زور دے کر کہا۔ "اب تم کیا کہتی ہو؟"

"تم مذاق کر رہے ہو؟" یاسمین کی آواز لرزنے لگی۔

"نہیں‘ اور اب تم پولیس کو یہ سب کچھ بتانے کے لئے بے تاب ہو رہی ہو گی؟"

یاسمین خوفزدہ تو تھی ہی.......... اب اسے غصہ آ گیا۔ "اگر بیگم شاہ کو پتہ چل جائے کہ ان کا بیٹا کیا حرکتیں کرتا پھر رہا.........."

"تم انہیں کچھ نہیں بتاؤ گی‘ سمجھیں؟" حارث نے اس کی بات کاٹ دی۔ "تم پولیس کو بھی کچھ نہیں بتاؤ گی‘ اگر وہ تم سے پوچھیں تو تم کہو گی کہ تم اس واقعے کے متعلق سب کچھ بھول چکی ہو‘ تمہیں کچھ بھی یاد نہیں ہے۔" چند لمحوں کے توقف کے بعد وہ دوبارہ بولا۔ "اگر تم نے زبان کھولی تو میں انہیں اس انگوٹھی کے بارے میں بتا دوں گا‘ جس کی چوری کی تم نے رپورٹ درج نہیں کرائی‘ اس لئے کہ تم ڈاکوؤں کے اس گینگ میں شامل ہو۔ پولیس والے یہ نتیجہ خود ہی اخذ کر لیں گے کہ تم نے ہی اپنے ساتھیوں کو شاہ پیلس کے متعلق بتایا ہو گا‘ ان کی مدد کی ہو گی جبکہ تمہارے ساتھی تمہارے کمرے میں غلطی سے آ گئے ہوں گے اور انہوں نے تمہاری انگوٹھی چرا لی ہو گی۔"

یاسمین سناٹے میں آ گئی پھر اس نے سنبھل کر کہا۔ "تمہارا کہا ہوا ہر لفظ مجھے مجبور کر رہا ہے کہ میں جا کر پولیس کو حقیقت بتا دوں حالانکہ میرا ایسا کوئی ارادہ نہیں تھا۔"

اب یاسمین کا جسم غصے سے لرز رہا تھا۔

"اس وقت تمہاری آنکھوں سے شعلے نکل رہے ہیں‘ غضب کی لڑکی ہو تم بھی۔"

حارث نے ستائشی لہجے میں کہا۔ "میرا خیال ہے‘ میں تم سے شادی کر لوں۔ اس طرح قانوناً تم میرے خلاف گواہی بھی نہیں دے سکو گی۔"

"پاگل ہو گئے ہو۔" یاسمین نے بے بسی سے کہا۔

"نہیں‘ یہ نہ سمجھو کہ میں ایسا نہیں کر سکتا۔ انکار کرو گی تو میں سب کو بتا دوں گا کہ تم شادی کے سلسلے میں میرے پیچھے پڑی ہوئی ہو اور اسی لئے دارالحکومت سے یہاں آئی ہو۔"

"تم مجھے ہرگز بلیک میل نہیں کر سکتے۔"

"ہاں‘ یہ ممکن ہے۔" حارث نے اس کا چہرہ ہاتھوں کے پیالے میں بھر لیا۔ "لیکن جان‘ اگر میں کہوں کہ شادی کرو یا میں.........." اس کے ہاتھ کھسک کر یاسمین کی گردن پر آ گئے اور وہ دھیرے دھیرے گرفت بڑھانے لگا۔ "اگرچہ یہ کام تمہاری محبت کی وجہ سے دشوار ثابت ہو گا لیکن کرنا تو پڑے گا ہی‘ بس تمہاری گردن پر ذرا سا دباؤ اور.........."

یاسمین نے چیخنے کی کوشش کی لیکن اس کے حلق سے محض گھٹی گھٹی چیخیں نکل کر رہ گئیں‘ وہ بری طرح ہاتھ پیر پھینکنے لگی۔ اسی وقت کسی ملازم نے اسے پکارا۔ "مس یاسمین‘ آپ کہاں ہیں‘ آپ کا فون ہے دارالحکومت سے۔"

حارث نے ہاتھ ہٹا لیا۔ یاسمین لڑکھڑاتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئی۔ "میں تمہارے ساتھ ہی چلوں گا۔" حارث نے اس کا ہاتھ تھامتے ہوئے کہا۔

وہ دونوں اندر چلے آئے۔ یاسمین نے ریسیور اٹھایا۔ دوسری طرف سے عامر بات کر رہا تھا۔ "سوری ڈیئر‘ میں نے دیر سے کال کیا‘ مصروفیت تھی بہت‘ سب معاملات طے ہو گئے ہیں۔"

"بہت خوب۔" یاسمین نے ماؤتھ پیس میں کہا۔

"کیا بات ہے! تمہاری آواز کو کیا ہو گیا۔ طبیعت تو ٹھیک ہے تمہاری؟" عامر کے لہجے میں تشویش تھی۔

"بالکل ٹھیک ہوں۔ مجھے امید ہے‘ تم جلد ہی واپس آ جاؤ گے۔" یاسمین نے گھٹی گھٹی آواز میں کہا حالانکہ وہ کہنا چاہتی تھی۔ "عامر.......... جلدی سے آ جاؤ۔ مجھے تمہاری

ضرورت ہے۔" لیکن حارث اس کے سر پر کھڑا تھا۔ یاسمین کو یقین ہو گیا تھا کہ وہ ایک سفاک قاتل ہے۔

"چچا نے تمہیں دعائیں کہلوائی ہیں اور تم نے کار بھی استعمال کی میری؟"

"نہیں' ابھی نہیں۔" یاسمین نے بمشکل کہا۔

"اپنا خیال رکھنا' شب بخیر۔"

ریسیور رکھنے کے بعد یاسمین پلٹی اور سیڑھیوں کی طرف بڑھ گئی۔ "شب بخیر۔" حارث نے طنزیہ لہجے میں کہا اور وہ جواب دیئے بغیر سیڑھیاں چڑھتی رہی۔

اپنے کمرے میں یاسمین' حارث کے بارے میں سوچتی رہی۔ اگر وہ شاہ صاحب اور بیگم شاہ کو حارث کی دھمکی کے بارے میں بتائے تو وہ اس کی بات پر یقین کہاں کریں گے' کوئی بھی یقین نہیں کرے گا اور پھر وہ اس سلسلے میں حارث سے وضاحت طلب کریں گے' یہ اور برا ہوگا۔ اس صورت میں حارث مشتعل ہوگا اور اس کی جان کے درپے ہو جائے گا پھر اس نے سوچا کہ عامر کو فون کر کے اسے صورتِ حال کے متعلق بتائے لیکن شاہ پیلس میں کئی ایکسٹینشن موجود تھے۔ یہ خدشہ تھا کہ حارث اب فون پر نظر رکھے گا۔ اسے احساس ہو گیا کہ وہ عامر سے مدد طلب کرے یا پولیس سے' ان دونوں صورتوں میں امکان یہی ہے کہ حارث مدد لینے سے قبل ہی اسے ٹھکانے لگا دے گا۔ اس کے بعد وہ گرفتار بھی ہو جائے تو کیا فائدہ۔

وہ سوچتی رہی۔ شاہ پیلس سے نکل بھاگنے ہی میں اس کی عافیت تھی بشرطیکہ وہ اس طرح نکلے کہ کسی کو پتہ نہ چلے اور اس کے پاس کار ہو۔ پھر اسے خیال آیا کہ اس کے پاس عامر کی کار کی چابیاں تو ہیں۔ اس کا مطلب ہے کہ وہ آج ہی رات نکل سکتی ہے۔ سوال یہ ہے کہ وہ جائے گی کہاں........ دارالحکومت؟ ناممکن' لیکن پھر اسے اپنی راجن پور والی خالہ کا خیال آ گیا۔ وہ اسے دیکھ کر خوش بھی ہوں گی' کب سے اسے بلا رہی تھیں۔

اب وہ فرار کا منصوبہ ترتیب دینے لگی۔ اسے سورج طلوع ہونے سے پہلے نکلنا ہوگا کیونکہ اس وقت سب لوگ گہری نیند میں ہوں گے' وہ کسی بک شاپ سے علاقے کا

سیاحتی نقشہ لے گی اور سفر شروع کر دے گی۔ اسے یہ سوچ کر افسوس ہونے لگا کہ وہ مسز شاہ کو نوٹس دیئے بغیر ملازمت چھوڑ رہی ہے بلکہ بھاگ رہی ہے لیکن وہ مجبور تھی۔ اس نے سوچا کہ وہ بیگم شاہ کو رقعہ لکھے گی اور معذرت کر لے گی۔

اس نے گھڑی دیکھی' چار بج رہے تھے۔ سوچنے میں وقت گزرنے کا پتہ ہی نہیں چلا تھا۔ اس نے اپنا پرس ٹٹولا' رقم اچھی خاصی تھی' تمام کپڑے اور سامان لے جانا ممکن نہیں تھا کیونکہ وہ اٹیچی کیس نہیں لے جانا چاہتی تھی' صرف ایک سفری بیگ بہت تھا۔ اس میں اس نے چند جوڑے کپڑے اور کچھ ضروری سامان رکھ لیا۔ اسے جج صاحب کے کاٹیج تک پہنچنے کے لئے جنگل والا شارٹ کٹ راستہ استعمال کرنا تھا چنانچہ اس نے جینز اور ٹی شرٹ پہنی۔ ٹی شرٹ پر سوئٹر اور پیروں میں چپلیں پھر اس نے بیگم شاہ کے نام رقعہ لکھا کہ بعض ذاتی وجوہات کی بنا پر میں فوری طور پر جانے پر مجبور ہو گئی ہوں' معذرت خواہ ہوں۔ پھر اس نے بڑی آہستگی سے دروازہ کھولا اور باہر نکل آئی۔ راہداری سنسان تھی' اس نے اپنے آفس روم میں ٹائپ رائٹر پر اپنا رقعہ چڑھایا اور وہاں سے نکل آئی۔

اس نے بڑی احتیاط سے صدر دروازے کا بولٹ گرایا اور باہر نکل کر دروازہ بھیڑ دیا۔ کنکریوں والے راستے پر چلنے کے بجائے اس نے لان کو ترجیح دی' وہ کوئی آہٹ پیدا نہیں کرنا چاہتی تھی۔ چند ہی لمحوں بعد اس نے لان کو عبور کر لیا اور جنگل میں داخل ہو گئی۔ تاریکی بہت گہری تھی لیکن وہ بے فکر تھی کیونکہ راستہ جانا پہچانا تھا۔

اب وہ مطمئن اور پُرسکون تھی۔ اسے سویرا ہونے سے پہلے جنگل عبور کر کے جج کے کاٹیج پہنچنا تھا' جہاں عامر کی کار موجود تھی اور یہ کام کچھ مشکل نہیں تھا۔ دوسری طرف حارث کو شبہ بھی نہیں ہوگا کہ وہ اتنی صبح فرار کی غرض سے نکل سکتی ہے اور جج کے کاٹیج کا رخ کر سکتی ہے۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ عامر اپنی کار کی چابیاں اسے دے گیا ہے۔ کار میں بیٹھتے ہی وہ محفوظ ہو جاتی۔

رات کے وقت جنگل بے حد مختلف لگ رہا تھا۔ یاسمین نے اندازہ لگایا کہ تھوڑی ہی دیر میں سپیدۂ سحر نمودار ہو جائے گا۔ بالخصوص درختوں کے نیچے گہری تاریکی تھی۔ اسے خوف آنے لگا' وہ چند لمحے کھڑی رہی۔ تمام تر قوتِ ارادی استعمال کرنے کے باوجود

اس کے قدم آگے بڑھنے پر آمادہ نہیں تھے۔ اسے کچھ دور راہ میں درپیش پہاڑی نالے کا خیال آ گیا۔ دن میں تو اسے عبور کرنا کچھ مشکل نہیں تھا۔ ابھرے ہوئے پتھروں پر پیر رکھتے ہوئے پار کر لیا جاتا تھا۔ وہ ابھرے ہوئے پتھر قدمچوں کی طرح تھے لیکن وہ جانتی تھی کہ اس اندھیرے میں وہ نالا پار کرنا آسان نہیں ہوگا۔

شاہ پیلس واپسی دشوار نہیں تھی۔ دروازہ اب بھی کھلا ہوا ہوگا۔ یہ الگ بات ہے کہ کسی ملازم نے اتفاقاً اٹھ کر دیکھا ہو کہ دروازہ کھلا رہ گیا ہے اور اسے بند کر دیا ہو۔ اس صورت میں وہ صبح کے وقت گھر کے باہر ٹہلتی پائی جاتی تو کتنی عجیب لگتی۔ یہ کچھ سوچ کر وہ بے اختیار ہنس دی اور اس ہنسی کے ساتھ ہی اس کا کھویا ہوا حوصلہ لوٹ آیا، وہ آگے بڑھ گئی۔

جنگل میں صرف حشرات الارض کی سرگوشیوں اور سرسراہٹوں کے سوا کوئی آواز نہیں تھی پھر اسے اپنے عقب سے قدموں کی آہٹ سنائی دی۔ آہٹ میں باقاعدگی تھی۔ گویا وہ کسی جانور کے پیروں کی چاپ نہیں تھی۔ ایسا لگتا تھا کہ اس کا کوئی تعاقب کر رہا ہے۔

وہ ٹھہر گئی۔ اس چاپ کے سلسلے میں اسے یقین درکار تھا۔ پھر اسے محسوس ہوا کہ اس کے قدموں کی چاپ کے ساتھ ہی عقبی چاپ بھی معدوم ہو گئی ہے۔ گویا وہ اس کی اپنی چاپ کی بازگشت تھی۔ شاید وہ نروس تھی، اسی لئے اس بازگشت سے خوفزدہ ہو گئی تھی۔ اسے احساس ہوا کہ اسے خود کو سنبھالنا ہوگا۔ یونہی ڈرتی رہی تو وہ منزل تک پہنچنے سے پہلے ہی خوف کے مارے مر جائے گی۔ اس جنگل میں ڈرنے کی کوئی بات ہی نہیں تھی۔ وہاں چھوٹے جانور تھے جو الٹا اس سے خوفزدہ ہو رہے ہوں گے۔

وہ پھر چل پڑی۔ عقب سے سنائی دینے والی چاپ بھی جاگ اٹھی لیکن اب وہ زیادہ فاصلے سے آتی محسوس ہو رہی تھی۔ یہ اس بات کا ثبوت تھا کہ پریشانی کی کوئی بات نہیں۔ اب وہ خشک نالے کے پاس پہنچ گئی تھی۔ چند لمحے وہ سوچتی رہی۔ اسے خوف تھا کہ کوئی سوتا ہوا سانپ اس کے پیر کے نیچے نہ آ جائے۔ اس نے اپنا بیگ نیچے رکھا، جھک کر پتھر اٹھایا اور نیچے پھینک دیا۔ پتھر دوسرے پتھروں سے ٹکراتا ہوا نیچے گرا پھر اس نے دوسرا پتھر

اچھالا لیکن پتھر کے سوا کوئی اور آواز سنائی نہ دی۔

اس نے اپنا بیگ اٹھایا اور بے حد احتیاط سے نیچے اترنے لگی۔ وہ پھونک پھونک کر قدم رکھ رہی تھی۔ بالآخر وہ نالے میں نیچے تک پہنچ گئی۔ اب اسے نالا عبور کرنا تھا۔ نالے کا پاٹ زیادہ نہیں تھا۔ درمیان میں پتھر تھے لیکن آخری پتھر کے بعد فاصلہ زیادہ تھا۔ اس پتھر پر پیر رکھ کر دوسری جانب اُگی ہوئی جھاڑیوں کو تھام کر چھلانگ لگانا پڑتی تھی۔ اس نے جھاڑی کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ اسی لمحے کلائی میں لپٹا ہوا بیگ اس کے ہاتھ سے نکلا اور نیچے لڑھکتا چلا گیا۔

وہ ایک لمحے کے لئے سوچتی رہی لیکن کڑھنے کے علاوہ کیا کر سکتی تھی۔ وہ اس سمت میں نیچے اتری، جہاں اس کے اندازے کے مطابق بیگ گرا تھا لیکن بیگ وہاں موجود نہیں تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ وہ گرنے کے دوران دائیں یا بائیں سمت لڑھکا ہے۔ اس نے ہاتھوں سے ٹٹولا پھر ٹھوکروں کے ذریعے اندازہ لگانے کی کوشش کی پھر وہ دائیں سمت چلی۔ بالآخر اسے بیگ نظر آ گیا۔ اس بار اس نے بیگ کو کلائی پر دہرا کر کے لپیٹا، اس کے بعد وہ پھر اوپر چڑھنے لگی۔

اچانک اسے احساس ہوا کہ آگے راستہ بند ہے یا شاید ہے ہی نہیں، حالانکہ یہ ممکن نہیں تھا۔ وہ جس راستے پر چل رہی تھی، وہ تو بالکل سیدھا تھا اور جج کے کاٹیج کی طرف جاتا تھا۔ سیدھے کا یہ مطلب نہیں کہ اس میں موڑ نہیں آتے تھے لیکن وہ کسی بھی مقام پر بند نہیں ہوتا تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ نالے سے نکل کر وہ غلط راستے پر آ گئی ہے۔

وہ ٹھہر گئی اور اس نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ اصل راستہ یقیناً قریب ہی ہوگا کیونکہ بیگ تلاش کرتے ہوئے وہ زیادہ دور نہیں ہٹی تھی، وہ دائیں جانب ہٹی تھی، اس کا مطلب تھا کہ صحیح راستہ بائیں سمت ہوگا۔ اس راستے پر دیوار کا ایک چھوٹا سا درخت تھا۔ اس کی کمر جتنا بلند۔ وہ اس درخت تک پہنچ گئی لیکن اگلے ہی لمحے اسے احساس ہوا کہ یہ وہ درخت نہیں ہے۔ اس وقت وہ جس راستے پر تھی، وہ بے حد تنگ تھا، شاید جانوروں کی گزرگاہ لیکن وہ اس توقع پر اس راستے پر چل دی کہ شاید وہ اسے اصل راستے تک پہنچا دے گا۔

اس کے قدم آگے بڑھنے پر آمادہ نہیں تھے۔ اسے کچھ دور راہ میں درپیش پہاڑی نالے کا خیال آ گیا۔ دن میں تو اسے عبور کرنا کچھ مشکل نہیں تھا۔ ابھرے ہوئے پتھروں پر پیر رکھتے ہوئے پار کر لیا جاتا تھا۔ وہ ابھرے ہوئے پتھر قدمچوں کی طرح تھے لیکن وہ جانتی تھی کہ اس اندھیرے میں وہ نالا پار کرنا آسان نہیں ہو گا۔

شاہ پیلس واپسی دشوار نہیں تھی۔ دروازہ اب بھی کھلا ہوا ہو گا۔ یہ الگ بات ہے کہ کسی ملازم نے اتفاقاً اٹھ کر دیکھا ہو کہ دروازہ کھلا رہ گیا ہے اور اسے بند کر دیا ہو۔ اس صورت میں وہ صبح کے وقت گھر کے باہر ٹہلتی پائی جاتی تو کتنی عجیب لگتی۔ یہی کچھ سوچ کر وہ بے اختیار ہنس دی اور اس ہنسی کے ساتھ ہی اس کا کھویا ہوا حوصلہ لوٹ آیا' وہ آگے بڑھ گئی۔

جنگل میں صرف حشرات الارض کی سرگوشیوں اور سرسراہٹوں کے سوا کوئی آواز نہیں تھی پھر اسے اپنے عقب سے قدموں کی آہٹ سنائی دی۔ آہٹ میں باقاعدگی تھی۔ گویا وہ کسی جانور کے پیروں کی چاپ نہیں تھی۔ ایسا لگتا تھا کہ اس کا کوئی تعاقب کر رہا ہے۔

وہ ٹھہر گئی۔ اس چاپ کے سلسلے میں اسے یقین درکار تھا۔ پھر اسے محسوس ہوا کہ اس کے قدموں کی چاپ کے ساتھ ہی عقبی چاپ بھی معدوم ہو گئی ہے۔ گویا وہ اس کی اپنی چاپ کی بازگشت تھی۔ شاید وہ نروس تھی' اسی لئے اس بازگشت سے خوفزدہ ہو گئی تھی۔ اسے احساس ہوا کہ اسے خود کو سنبھالنا ہو گا۔ یونہی ڈرتی رہی تو وہ منزل تک پہنچنے سے پہلے ہی خوف کے مارے مر جائے گی۔ اس جنگل میں ڈرنے کی کوئی بات ہی نہیں تھی۔ وہاں چھوٹے جانور تھے جو الٹا اس سے خوفزدہ ہو رہے ہوں گے۔

وہ پھر چل پڑی۔ عقب سے سنائی دینے والی چاپ بھی جاگ اٹھی لیکن اب وہ زیادہ فاصلے سے آتی محسوس ہو رہی تھی۔ یہ اس بات کا ثبوت تھا کہ پریشانی کی کوئی بات نہیں۔ اب وہ خشک نالے کے پاس پہنچ گئی تھی۔ چند لمحے وہ سوچتی رہی۔ اسے خوف تھا کہ کوئی سوتا ہوا سانپ اس کے پیر کے نیچے نہ آ جائے۔ اس نے اپنا بیگ نیچے رکھا' جھک کر پتھر اٹھایا اور نیچے پھینک دیا۔ پتھر دوسرے پتھروں سے ٹکراتا ہوا نیچے گرا پھر اس نے دوسرا پتھر

اچھالا لیکن پتھر کے سوا کوئی اور آواز سنائی نہ دی۔

اس نے اپنا بیگ اٹھایا اور بے حد احتیاط سے نیچے اترنے لگی۔ وہ پھونک پھونک کر قدم رکھ رہی تھی۔ بالآخر وہ نالے میں نیچے تک پہنچ گئی۔ اب اسے نالا عبور کرنا تھا۔ نالے کا پاٹ زیادہ نہیں تھا۔ درمیان میں پتھر تھے لیکن آخری پتھر کے بعد فاصلہ زیادہ تھا۔ اس پتھر پر پیر رکھ کر دوسری جانب اگی ہوئی جھاڑیوں کو تھام کر چھلانگ لگانا پڑتی تھی۔ اس نے جھاڑی کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ اسی لمحے کلائی میں لپٹا ہوا بیگ اس کے ہاتھ سے نکلا اور نیچے لڑھکتا چلا گیا۔

وہ ایک لمحے کے لئے سوچتی رہی لیکن کڑھنے کے علاوہ کیا کر سکتی تھی۔ وہ اس سمت میں نیچے اتری' جہاں اس کے اندازے کے مطابق بیگ گرا تھا لیکن بیگ وہاں موجود نہیں تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ وہ گرنے کے دوران دائیں یا بائیں سمت لڑھکا ہے۔ اس نے ہاتھوں سے ٹٹولا پھر ٹھوکروں کے ذریعے اندازہ لگانے کی کوشش کی پھر وہ دائیں سمت چلی۔ بالآخر اسے بیگ نظر آ گیا۔ اس بار اس نے بیگ کو کلائی پر دہرا کر کے لپیٹا' اس کے بعد وہ پھر اوپر چڑھنے لگی۔

اچانک اسے احساس ہوا کہ آگے راستہ بند ہے یا شاید ہے ہی نہیں' حالانکہ یہ ممکن نہیں تھا۔ وہ جس راستے پر چل رہی تھی' وہ تو بالکل سیدھا تھا اور جج کے کاٹیج کی طرف جاتا تھا۔ سیدھے کا یہ مطلب نہیں کہ اس میں موڑ نہیں آتے تھے لیکن وہ کسی بھی مقام پر بند نہیں ہوتا تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ نالے سے نکل کر وہ غلط راستے پر آ گئی ہے۔

وہ ٹھہر گئی اور اس نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ اصل راستہ یقیناً قریب ہی ہو گا کیونکہ بیگ تلاش کرتے ہوئے وہ زیادہ دور نہیں ہٹی تھی' وہ دائیں جانب ہٹی تھی' اس کا مطلب تھا کہ صحیح راستہ بائیں سمت ہو گا۔ اس راستے پر دیودار کا ایک چھوٹا سا درخت تھا۔ اس کی کمر جتنا بلند۔ وہ اس درخت تک پہنچ گئی لیکن اگلے ہی لمحے اسے احساس ہوا کہ یہ وہ درخت نہیں ہے۔ اس وقت وہ جس راستے پر تھی' وہ بے حد تنگ تھا' شاید جانوروں کی گزرگاہ لیکن وہ اس توقع پر اس راستے پر چل دی کہ شاید وہ اسے اصل راستے تک پہنچا دے گا۔

کچھ دیر چلنے کے بعد اسے اندازہ ہوا کہ وہ بری طرح بھٹک گئی ہے۔ اب اسے وہ راستہ بھی نہیں مل رہا تھا جسے اس نے بند پایا تھا' ورنہ وہ وہاں سے دائیں سمت چل کر دیکھتی۔ ایسا لگتا تھا کہ اب صحیح راستہ تلاش کرنے کے لئے اسے صبح تک انتظار کرنا ہوگا۔ وہ تھکے تھکے انداز میں بڑے گول پتھر پر ٹک گئی۔

اچانک اسے پھر قدموں کی چاپیں سنائی دیں اور وہ چوکنا ہو گئی۔ اس بار وہ اسے بازگشت قرار نہیں دے سکتی تھی کیونکہ وہ خود ٹھہری ہوئی تھی پھر قدموں کی چاپ رک گئی۔ اس نے کسی ابھرے ہوئے پتھر سے ٹھوکر لگنے کی آواز' کراہ اور مردانہ آواز میں گالی بھی سنی۔ اس کا جسم لرزنے لگا۔

اس نے بہت تیزی سے سوچا اور پھر اردگرد کوئی جائے پناہ تلاش کرنے میں مصروف ہو گئی۔ اس وقت تو راہ سے بھٹکنا ہی اس کے کام آ گیا تھا ورنہ وہ بازگشت کے دھوکے میں رہتی اور بہ آسانی ماری جاتی۔ وہ جھاڑیوں میں گھسی آگے بڑھتی رہی۔ کھلی جگہ پر بھاگتے ہوئے وہ جھک جاتی۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ متعاقب اسے دیکھے۔ بالآخر وہ بھاگتے بھاگتے تھک گئی۔ اس کا سانس پھول گیا۔

اس وقت اسے دو بڑے گول پتھروں کے درمیان ایک غار سا نظر آیا۔ اس نے اطمینان کا سانس لیا اور رینگتی ہوئی غار میں داخل ہو گئی۔ اسے خوف تھا کہ وہ کسی جانور کی آرام گاہ ثابت نہ ہو لیکن خوش قسمتی سے غار خالی تھا۔ پھر بھی وہ اس غار میں زیادہ دیر نہیں ٹھہر سکتی تھی۔ متعاقب کسی بھی لمحے اسے تلاش کر سکتا تھا۔ ویسے بھی اسے جلد از جلد جج کے کاٹیج تک پہنچنا تھا بلکہ عامر کی کار تک۔ چنانچہ کچھ دیر سانس درست کرنے کے بعد وہ غار سے نکل آئی اور آہستہ آہستہ ایک طرف چل دی۔ اس بار وہ خود کو تھکا دینے کے موڈ میں نہیں تھی۔

کچھ دیر بعد اسے کھویا ہوا راستہ مل گیا۔ اس وقت اسے پتہ چلا کہ اس سے کیا غلطی سرزد ہوئی تھی۔ بیگ اٹھانے کے بعد اس نے سمت کا خیال تو رکھا تھا لیکن نالے کے اسی کنارے کی طرف نکل گئی تھی جس سے آئی تھی۔ ظاہر ہے' اس کے نتیجے میں سمت بھی غلط ہو گئی اور وہ اصل مقام سے دور ہو گئی۔

صحیح راستے پر پہنچ کر اسے سوچنا پڑا۔ کیا اس راستے پر سفر کر کے وہ خود اپنے شکاری کے پاس جا رہی ہے؟ لیکن کچھ بھی ہو' اسے یہ خطرہ تو مول لینا ہی تھا۔ وہ جانے پہچانے راستے پر چل پڑی۔ اب اس کی رفتار تیز تھی۔ بالآخر اسے جج کا کاٹیج نظر آیا۔ وہ بے اختیار چیخ اٹھی۔ "وہ رہا۔" اسے فوراً ہی اپنی حماقت کا احساس ہو گیا۔ جنگل کے سناٹے میں آواز دور تک جاتی ہے لیکن اس کی چیخ کے ساتھ کوئی پرندہ بھی چہچہایا تھا۔ اس کی آواز دب گئی۔ وہ چند لمحے ساکت کھڑی رہی۔ کسی طرف سے کوئی ردِعمل ظاہر نہیں ہوا۔ وہ گیراج کی طرف بھاگنے لگی جو اب تھوڑی ہی دور رہ گیا تھا۔ اب وہ ہانپ رہی تھی۔ بیگ اسے منوں وزنی معلوم ہو رہا تھا۔

گیراج کے دروازے پر پہنچ کر اس نے تالے میں چابی لگائی۔ اس کا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ عامر نے بھول سے غلط چابی نہ دے دی ہو لیکن چابی گھومی اور دروازہ کھل گیا۔ اندر کار موجود تھی۔ اس نے کار کا دروازہ کھول کر بیگ کار میں پھینکا اور خود ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گئی۔ اس نے کار اسٹارٹ کر کے باہر نکالی۔ گاڑی کو نیوٹرل میں ڈال کر وہ اتری اور اس نے گیراج کا دروازہ مقفل کر دیا۔ پھر وہ دوبارہ کار میں بیٹھی اور اسے آگے بڑھا دیا۔

بلاارادہ اس کی نظر اس راستے کی طرف اٹھ گئی' جس پر چل کر وہ کاٹیج تک آئی تھی۔ وہ سورج کی اولیں کرنوں کی چمک تھی یا بھورے گھونگھریالے بال؟ بہرحال' ایک جھاڑی کے پیچھے اس نے ایک جھلک دیکھی تھی لیکن اب وہ مطمئن تھی۔ وہ پیدل نہیں تھی بلکہ کار میں تھی اور فرار ہونے میں کامیاب ہو گئی تھی۔

کار بہت اچھی کنڈیشن میں تھی۔ وہ پوری رفتار سے اسے دوڑا رہی تھی۔ اسے احساس تھا کہ پٹرول ڈلوانا بہت ضروری ہے لیکن وہ پہلے اپنے اور اپنے شکاری کے درمیان معقول فاصلہ قائم کرنا چاہتی تھی۔ چنانچہ اس نے سفر جاری رکھا۔

سات بجے کے قریب اس نے کار پٹرول پمپ پر روکی۔ اٹینڈنٹ کو ٹنکی فل کرنے کی ہدایت دے کر وہ قریبی ریسٹورنٹ کی طرف چل دی۔ وہاں اس نے جلدی جلدی ناشتہ کیا اور پھر باہر نکل کر ایک بک شاپ سے سیاحتی نقشہ لیا۔ واپس آ کر اٹینڈنٹ کو ادائیگی

کی اور سفر دوبارہ شروع کر دیا۔

راستے میں اس نے نقشہ پھیلا کر اس کا جائزہ لیا اور اپنا راستہ ذہن نشین کر لیا۔

اس وقت وہ جس سڑک سے گزر رہی تی اس کے اطراف میں بے حد دلکش مناظر تھے۔

اس کا جی چاہا کہ اتر کر سیر کرے لیکن ہر بار خوف آڑے آ گیا۔ وہ اب بھی اپنے اور حارث کے فاصلے سے مطمئن نہیں تھی۔

اس کی کار کے آگے تین ٹرک تھے۔ ان کی رفتار نہایت سُست تھی' سڑک بہت تنگ تھی۔ اس نے ہارن دیا اور اوور ٹیک کرنے کے بعد گاڑی کو اپنی سائیڈ پر ڈالا لیکن اس سے پہلے ہی وہ عقب نما آئینے میں دیکھ چکی تھی اور جو کچھ اس نے دیکھا تھا وہ اسے لرزانے کے لئے کافی تھا۔ ایک لمحے کے لئے اس کا دل جیسے دھڑکنا بھول گیا۔ تینوں ٹرکوں کے پیچھے اچانک ہی ایک سرخ کار نمودار ہوئی تھی اور وہ یقینی طور پر حارث کی کار تھی۔

ایکسیلیٹر پر اس کے پاؤں کا دباؤ بڑھتا گیا۔ اس نے عقب نما آئینے پر بھی نظر رکھی تھی۔ حارث کو ٹرکوں کو اوور ٹیک کرنے کا موقع نہیں مل رہا تھا۔ میل تیزی سے اڑتے جا رہے تھے۔ ابھی تک حارث کی کار دکھائی نہیں دی تھی۔ اب کار پہاڑ کی دوسری سمت ڈھلوان کا سفر طے کر رہی تھی۔ موڑ بے حد خطرناک تھے۔ اب عقب نما آئینے میں ٹرک بھی نظر نہیں آ رہے تھے۔ اس نے اپنی کار کی رفتار کم نہیں کی۔ وہ بہت زیادہ خوفزدہ تھی۔

سامنے ایک پہاڑی قصبے کے آثار دکھائی دینے لگے تھے۔ اس نے سوچا رک کر کچھ کھانے پینے کا بندوبست کرے لیکن زندگی بہرحال بھوک سے زیادہ قیمتی تھی۔ اس نے سفر جاری رکھنے کا فیصلہ کیا۔ منزل ابھی خاصی دور تھی۔

قصبے کے پاس سے گزرتے ہوئے اسکول کے بچوں کا اجتماع نظر آیا۔ وہ کسی قسم کی پریڈ کی تقریب معلوم ہوتی تھی۔ بچے یونیفارم میں تھے۔ آگے کچھ اساتذہ تھے۔ ان کے ہاتھوں میں پرچم تھے' وہ سڑک کی طرف بڑھ رہے تھے۔ یاسمین نے کار کی رفتار اور بڑھا دی۔ جلوس کے سڑک پر پہنچنے سے پہلے وہ سڑک کے اس حصے سے آگے نکل چکی تھی۔

اس نے کار کی رفتار کم کر کے عقب نما آئینے میں دیکھا۔ جلوس اب سڑک پر پہنچ گیا تھا

اور سڑک پر وہ اسی طرف بڑھ رہا تھا جس طرف سے وہ آئی تھی۔ اس نے سکون کی سانس لی اور جسم کو ڈھیلا چھوڑ دیا۔

قصبے کی حدود سے نکلتے ہی اس نے کار کی رفتار پھر بڑھا دی۔ خوش قسمتی اس کے ساتھ تھی۔ حارث کو پہلے تین سُست رفتار ٹرکوں نے روکا تھا اور اب اسے یقیناً اس جلوس کی وجہ سے تاخیر ہوگی۔ یاسمین کو احساس تھا کہ حارث کی کار رفتار کے اعتبار سے اس کی کار پر فوقیت رکھتی ہے' اسی لئے وہ اپنی خوش قسمتی سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھا کر فاصلہ آخری حد تک بڑھانے کی خواہش مند تھی۔

جیسے ہی پہلی ذیلی سڑک نظر آئی' اس نے گاڑی اس پر ڈال دی۔ سڑک کے اطراف میں ہرے بھرے کھیت تھے۔ چند میل کا فاصلہ طے کرنے کے بعد لکڑی کا ایک پُل سامنے آ گیا۔ وہ دیکھنے ہی میں خاصا مخدوش لگ رہا تھا۔ اس قسم کے پُل اس علاقے میں بہت عام تھے۔ پُل کے نیچے تند و پُرشور پہاڑی دریا بہہ رہا تھا۔ چٹانوں سے سر ٹکراتا' شور مچاتا' جھاگ اڑاتا۔ پُل کے اس طرف ایک بورڈ نصب تھا۔ "یہ پُل مخدوش ہے' اس پر گزرتے ہوئے اپنے گھوڑوں سے اتر جایئے۔ گاڑیاں گزارنے کی سخت ممانعت ہے۔"

یاسمین نے بغیر ہچکچائے گاڑی پُل پر دوڑا دی۔ پُل چرچراتا رہا' خطرناک آواز میں احتجاج کرتا رہا۔ چند ایک تختے بھی نکل کر دریا میں جا گرے۔ پُل کے ساتھ ساتھ کار بھی بری طرح ڈول رہی تھی لیکن واپسی کا سوال ہی نہیں تھا۔ وہ دھڑکتے دل کے ساتھ ڈرائیو کرتی رہی۔ اس نے عقب نما آئینے میں پُل کے عقبی حصے کی طرف بنے ہوئے کیبن سے ایک بڈھے آدمی کو نکلتے دیکھا' وہ اسے دیکھ کر ہاتھ لہرا رہا تھا اور چیخ چیخ کر کچھ کہہ رہا تھا پھر اس نے پُل کے راستے پر زنجیر کھینچ کر باندھ دی۔

بالآخر وہ بخیریت پُل کے دوسری طرف پہنچ گئی۔ سڑک پر پہنچتے ہی اس نے گاڑی پوری رفتار پر چھوڑ دی۔ اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ وہ اس مخدوش پُل پر سے اپنی کار سمیت بخیر و عافیت گزر آئی ہے۔ اسی لمحے اسے عقب نما آئینے میں حارث کی سرخ کار کی جھلک دکھائی دی پھر سرخ کار پُل کے سرے پر رکی۔ حارث چند لمحے پُل کے بڈھے

چوکیدار سے بحث کرتا رہا پھر یاسمین نے اسے دروازہ کھول کر باہر نکلتے دیکھا۔

یاسمین نے گاڑی بائیں جانب والی سڑک پر موڑ دی۔ ایکسیلیٹر پر اس کے پاؤں کا دباؤ بڑھ گیا تھا۔

☆------☆------☆

یاسمین کا خوف بڑھ گیا تھا۔ حارث نے اس کی توقع کے برعکس فاصلہ بہت تیزی سے کم کیا تھا۔ پُل عبور کرنے کی صورت میں یہ بات یقینی تھی کہ حارث جلد ہی اسے آ لے گا۔ اس نے جلدی سے نقشہ کھولا۔ یہ بھی خوش قسمتی ہی تھی کہ وہ صحیح راستے پر تھی۔ دو منٹ بعد وہ مین روڈ پر پہنچ گئی۔ راجن پور اب زیادہ دور نہیں تھا۔

وہ سوچ میں پڑ گئی۔ یہ بات نامناسب معلوم ہوتی تھی کہ وہ حارث کو اپنے پیچھے لگا کر زبیدہ خالہ کے گھر پہنچے اور انہیں بھی مصیبت میں پھنسائے لیکن اس کے علاوہ کوئی چارہ بھی تو نہیں تھا۔ آدمی مصیبت کے وقت اپنوں ہی کی طرف تو دیکھتا ہے۔ چنانچہ وہ راجن پور کی طرف بڑھتی رہی۔

راجن پور پہنچتے پہنچتے شام ہو گئی۔ وہ بھوک اور تھکن سے نڈھال ہو رہی تھی لیکن زبیدہ خالہ کی صورت دیکھ کر اسے بڑا سکون ملا۔ خالہ بھی اسے دیکھ کر کھل اٹھیں۔

وہ نہا دھو کر تروتازہ ہو گئی لیکن حارث کا خوف اب بھی اس کے ذہن پر مسلط تھا۔

خالہ نے ریڈیو آن کر دیا۔ خبریں ابھی شروع ہوئی تھیں۔ پھر نیوز ریڈر کی آواز نے اسے چونکا دیا۔ ”آج راجن پور سے بیس میل دور ایک حادثے میں ایک شخص ہلاک ہو گیا۔ متوفی سرخ کار میں تھا۔ حادثہ ایک مخدوش پُل پر سے گزرتے ہوئے پیش آیا۔ پُل گر گیا اور کار ایک دریائی چٹان سے ٹکرا کر پاش پاش ہو گئی۔ لاش نکال لی گئی ہے۔ کاغذات سے پتہ چلتا ہے کہ متوفی حارث شاہ رام گڑھ کا رہنے والا تھا۔ وہ رام گڑھ کے مشہور صنعت کار وارث شاہ اور مشہور سماجی شخصیت بیگم تمکین شاہ کا اکلوتا بیٹا تھا۔ پُل کے چوکیدار نے اسے کار کو پُل پر سے لے جانے سے باز رکھنے کی کوشش کی تھی اور اسے سمجھایا تھا مگر متوفی نے چوکیدار کو بے ہوش کر دیا اور اس من مانی کے نتیجے میں جان سے ہاتھ دھو بیٹھا.........“

یاسمین نے بے اختیار سکون کا سانس لیا پھر اسے زیادتی کا احساس ہوا۔ کسی انسان کی موت پر یوں سکون بھی محسوس کیا جا سکتا ہے۔ بہرحال‘ ڈاکوؤں کا سرغنہ اور دارالحکومت کے ایک ہوٹل کے مالک کا قاتل اپنے انجام کو پہنچ گیا تھا اور اب وہ محفوظ تھی۔ اسے اس بات کی خوشی تھی کہ اس کے جرائم کا راز فاش نہیں ہوا اور یوں شاہ صاحب اور بیگم شاہ شرمندگی سے بچ گئے۔ اب وہ عمر بھر اپنے مرحوم بیٹے کو محبت کے ساتھ یاد رکھیں گے۔

اچانک اسے عامر کا خیال آ گیا۔ اس نے خالہ کے گھر سے عامر کو فون کیا۔ ”ہیلو عامر.........میں یاسمین بول رہی ہوں۔“

”تم کہاں ہو‘ میں نے شاہ پیلس فون کیا تھا.........؟“

”وہ تمام تفصیل میں ملنے پر بتاؤں گی۔“ یاسمین نے اس کی بات کاٹ دی۔ پھر اس نے عامر کو خالہ کا پتہ بتایا۔

”یہاں میری ملازمت کے تمام معاملات طے پا گئے ہیں؟“

”مبارک ہو۔“

”اور اب میں تم سے وہ بات پوچھ رہا ہوں جو مجھے پوچھنا تھی‘ مجھ سے شادی کرو گی؟“

یاسمین کا چہرہ تمتما اٹھا۔ اسے احساس تھا کہ خالہ اسے بہت غور سے دیکھ رہی ہیں۔

”یہاں آ کر خالہ سے بات کرنا۔“ اس نے آہستہ سے کہا۔

”او کے۔ میں انشاء اللہ پرسوں آ رہا ہوں۔ اپنا خیال رکھنا‘ میری خاطر۔ خدا حافظ۔“

اس نے ریسیور رکھ دیا لیکن وہ خالہ سے نظریں چرا رہی تھی۔

”یہ تم نے اچھا کیا کہ مجھ سے بات کرنے کو کہا۔“ خالہ بولیں۔ ”آخر تمہاری رخصتی تو یہیں سے ہو گی۔ اب مجھے اس عامر کے بارے میں بتاؤ۔“

وہ شرماتی رہی اور عامر کے بارے میں بتاتی رہی۔ اس نے حارث کے بارے میں ایک لفظ بھی نہیں کہا۔ یہ بوجھ تو وہ صرف عامر کے سامنے ہلکا کر سکتی تھی اور عامر پرسوں آ رہا تھا۔

اگلے روز اخبار کے ذریعے اسے پتہ چلا کہ حارث' وارث شاہ اور بیگم شاہ کا بیٹا نہیں بلکہ لے پالک تھا۔ شاید اسی لئے وہ خود کو منوانے کی غرض سے جرم کی راہ پر چل نکلا تھا لیکن اس کے جرائم کا راز آخر تک فاش نہیں ہو سکا تھا۔ اس کے بارے میں صرف وہ جانتی تھی یا اب عامر کو معلوم ہو گا لیکن اس نے طے کر لیا تھا کہ نہ خود زبان کھولے گی اور نہ عامر کو کھولنے دے گی' اچھے لوگوں کو بلاوجہ دکھ کیوں دیا جائے۔

☆======ختم شد======☆